مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر و مضامین کا موضوع وار مجموعہ

مُعاملات (حصہ دوم)

جلد: ۹

مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی

مواعظِ عثمانی

معاملات

جلد: ۹

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا عنایت الرحمن

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

عرض ناشر: الحمد للہ اگر چہ مکتبہ معارف القرآن کراچی نے "مواعظ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی

طبع جدید : جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ - دسمبر ۲۰۲۲ء

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی

ترتیب وڈیزائننگ : عمران خان

فون : (92-21) 35031565, 35123130

ای میل : info@mmqpk.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com

آن لائن : fb/onlinesharia

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان- 75180

آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے
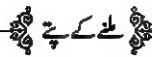
- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدر آباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمر گرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرّہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کررہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کرلیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آگیا جس کی اب غالبا ۲۵ جلدیں ہوچکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ وخطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کرکے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کردیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماکر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

بندہ
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
دارالعلوم کراچی ۱۴
۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ

عرضِ ناشر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

زیرِ نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلد نہم ''معاملات (حصہ دوم)'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہورہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثانی

- حضور ﷺ نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فرد کی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر وفکر

The Islamic months

اور اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریر ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، نیز ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ اور صوتی صورت میں محفوظ شدہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بعض بیانات و خطبات کو شامل کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس کی تصحیح اور تحقیق کا اہتمام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات ومضامین کا جامع اور مستند ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب، تحقیق وتخریج حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر ان کی نگرانی میں مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کی ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات اور تحقیق وتخریج کا طریقۂ کار اس مجموعہ کی پہلی جلد ''ایمان وعقائد ونظریات (حصہ) اوّل'' کے شروع میں درج ہے، اس کی مراجعت ان شاء اللہ مفید رہے گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے ادارہ کے جملہ احباب ومعاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین یا رب العالمین۔

خضر قاسمی (ناظم ادارہ)
مکتبہ معارف القرآن کراچی
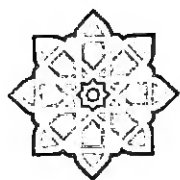
فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرستِ عنوانات

تفصیلی فہرست

ہمارا معاشی نظام

(ہمارا معاشی نظام ص ۹)

ہمارا معاشی نظام

کسی قوم کی معاشی حالت کو بہتر اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس کے تمام افراد کو زندگی کی تمام ضروریات فارغ البالی اور سکون واطمینان کے ساتھ میسر ہوں، ملک کی پیداوار اور آمدنی اگر زیادہ ہو تو ملک کے تمام باشندے اس کی برکات سے مستفید ہوں، اور کسی کو تقسیمِ دولت کے معاملے میں کسی نا انصافی کی جائز شکایت نہ ہو، اس کے برخلاف اگر ملک کی ساری دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور قوم کی اکثریت بھوک وافلاس کا رونا رو رہی ہو، امیروں کے خزانے میں دولت کے انبار پر انبار لگتے چلے جائیں اور محنت کش عوام سے ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ایک پیسہ سرک کر ختم ہوجائے تو خواہ ملک کی زمینیں سونا اگل رہی ہوں یا مشینوں سے لعل وجواہر برآمد ہو رہے ہوں اسے ملک کی معاشی ترقی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہ اجتماعی دیوالیہ پن ہے جس کی موجودگی میں کسی قوم کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ہماری شومئ اعمال ہے کہ ہمارے ملک کی معاشی صورتِ حال کچھ ایسی

ہی بن کر رہ گئی ہے، اوپر سے دیکھیے تو ہم نے گزشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے، جب پاکستان بنا تھا تو ہمارے پاس کچھ نہیں تھا اور آج خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی یہ چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کر سکی، اس کے شب و روز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دو سو سالہ محکومی نے ہمارے دل و دماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کے بجائے آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھا دی تھی۔ زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے سرمایہ دار ''حاکم'' نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

سالہا سال تک اس طرزِ معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمد اللہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن

مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے بھی ہم مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی ایسے حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور وشور سے ''سوشلزم'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے لگا رہا ہے، حالانکہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا۔ حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اُس کے پاس تھا نہ اِس کے پاس ہے، وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے، مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصوّر پر تھی کہ انسان سرمایے کا خودمختار مالک ہے، روز مرہ کی ضروریات کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے۔ وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے، جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو چاہے قیمت مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے اور ریاست اس کی ملکیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کرسکتی، اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دوچار ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کردی گئیں، لیکن

ہی بن کر رہ گئی ہے، اوپر سے دیکھیے تو ہم نے گزشتہ ۲۶ سالوں میں زراعت صنعت اور تجارت کے ہر میدان میں خاصی ترقی کی ہے، جب پاکستان بنا تھا تو ہمارے پاس کچھ نہیں تھا اور آج خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے، لیکن افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی، اس سے عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرداں ہے، دولت کی یہ چمک دمک اس کے غم کدے میں کوئی اجالا نہیں کرسکی، اس کے شب و روز پہلے سے زیادہ سختیوں کا شکار ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے، ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں رائج ہے، مغرب کی دو سو سالہ محکومی نے ہمارے دل و دماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ہم اپنے مسائل کو آزادی کے ساتھ سوچنے کے بجائے آنکھیں بند کرکے اسی ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے ہمیں دکھا دی تھی۔ زندگی کے دوسرے گوشوں کی طرح ہم نے اپنی معیشت کو بھی ان ہی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جن پر ہمارے سرمایہ دار ''حاکم'' نے اپنے معاشرے کو تعمیر کیا تھا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمیں اس بے چینی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔

سالہا سال تک اس طرزِ معیشت کو آزمانے کے بعد اب یہ شعور تو بحمد اللہ پیدا ہونے لگا ہے کہ یہ راستہ ترقی کا نہیں تباہی کا ہے، ہم میں سے بیشتر لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ ہماری معاشی ناہمواریوں کی ذمہ داری موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیری نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ابھی ذہن

مغرب کے فکری تسلط سے اتنے آزاد نہیں ہوئے کہ اس کی فکری کج روی کو آزما کر خود اپنے ذہن سے کوئی متبادل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں، اس کے بجائے ہو یہ رہا ہے کہ سرمایہ داری کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے بھی ہم مغرب ہی کا رخ کرتے ہیں اور کسی ایسے حل کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مغرب کی فکری مشینری میں نہ ڈھلا ہو۔

چنانچہ آج ہم میں سے ایک طبقہ بڑے زور وشور سے ''سوشلزم'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے لگا رہا ہے، حالانکہ اشتراکیت بھی مغرب کی اسی مادی تہذیب کی پیداوار ہے جس نے سرمایہ داری کو جنم دیا تھا۔ حقیقت میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل نہ اُس کے پاس تھا نہ اِس کے پاس ہے، وہ اگر افراط تھی تو یہ تفریط ہے، مزدور اور کسان اگر سرمایہ داری میں مظلوم اور مقہور تھے تو اشتراکی نظام میں بھی وہ کچھ کم بے بس نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ انسان سرمایے کا خود مختار مالک ہے، روز مرہ کی ضروریات کے علاوہ ذرائع پیداوار پر بھی اس کی ملکیت بے قید اور آزاد ہے۔ وہ جس طرح چاہے انہیں استعمال کرے، جس کام میں چاہے انہیں لگائے، جس طریقے سے چاہے ان سے نفع حاصل کرے، اپنے تیار شدہ مال کی جو چاہے قیمت مقرر کرے، جتنے آدمیوں سے جن شرائط پر چاہے کام لے، غرض اپنے کاروبار کے بارے میں اسے کھلی آزادی ہے اور ریاست اس کی ملکیت میں کوئی دخل اندازی نہیں کرسکتی، اگرچہ رفتہ رفتہ مختلف تجربات سے دو چار ہونے کے بعد اس آزاد ملکیت پر تھوڑی تھوڑی پابندیاں عائد کردی گئیں، لیکن

یہ تصوّر اب بھی پوری طرح برقرار ہے کہ انسان سرمایے کا مالک ہے اور چند قانونی حد بندیوں سے قطع نظر سرمایے سے سرمایہ پیدا کرنے کا ہر طریقہ اس کے لیے جائز ہے، اسی تصوّر کی بنیاد پر سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کو اس نظام میں شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے اور یہ چیزیں اس نظام کے عناصرِ اربعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس نظام کے جو نتائجِ بد دنیا نے دیکھے اور اب تک دیکھ رہی ہے وہ یہ ہیں کہ معاشرے میں دولت کی گردش نہایت ناہموار اور غیر متوازن ہوتی چلی جاتی ہے، سرمایہ دار سود، قمار، سٹہ اور اکتناز کے ذریعے چاروں طرف ہاتھ مار کر روپیہ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور دولت کے اس ذخیرے کے بل پر پورے بازاروں کا حکمران بن بیٹھتا ہے، قیمتوں کو مصنوعی طور پر چڑھایا اور گرایا جاتا ہے اور غیر ضروری اشیاء، بلکہ مضر اشیاء کو زبردستی معاشرے پر ٹھونسنے کے لیے ان کی فراوانی کردی جاتی ہے اور قوم کی حقیقی ضروریات کا معاشی قحط پیدا کردیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نظام میں بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عین اس وقت جب کہ معاشرے کے سینکڑوں افراد بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں غلّے اور اشیائے خورد ونوش کے لدے ہوئے جہاز جان بوجھ کر غرق کردیے جاتے ہیں، ان کے ذخیروں کو آگ لگادی جاتی ہے تاکہ یہ اشیاء افراط کے ساتھ بازار میں آکر سستے داموں ضرورت مند افراد تک نہ پہنچ سکیں اور قیمتوں کا جو معیار سرمایہ دار نے مقرر کیا ہے اس میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کی اس کاروباری آنکھ مچولی میں ایک عام آدمی کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکتا، اس کی آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس کی زندگی چند گنے چنے افراد کے ذاتی مفادات کے تابع ہوکر رہ جاتی

ہے، دولت کے اس سمٹاؤ کا اثر پوری قوم کی صرف معیشت پر ہی نہیں، بلکہ اخلاق وکردار اور طرزِ فکر وعمل پر بھی پڑتا ہے اور ملکی وبین الاقوامی سیاست بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ان خرابیوں کو تو دیکھا، لیکن مرض کے اسباب کی ٹھنڈے دل و دماغ سے تشخیص نہ کرسکی اور معاملے کی دوسری انتہا پر جا کھڑی ہوئی، سرمایہ داری نے کہا تھا کہ انسان بحیثیتِ فرد ذرائع پیداوار کا مالک ہے، اشتراکیت نے کہا کہ کوئی فرد کسی ذریعۂ پیداوار کا مالک نہیں، زمینوں اور کارخانوں کو جاگیردار اور سرمایہ دار کے تصرف سے نکال دو، تو وہ بانس ہی نہ رہے گا جس سے ظلم کی بانسری بجتی ہے، اس کی عملی شکل یہ تجویز کی گئی کہ محنت کش عوام کے انتخاب سے ایک کمیٹی بناؤ اور ملک کی تمام زمینیں اور ساری بنیادی صنعتیں انفرادی ملکیت سے نکال کر اس کے حوالے کردو، یہ پارٹی ایک حکومت کی تشکیل کرکے ایک منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کی بنیاد ڈالے گی، وہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کیا چیز پیدا کرنی ہے؟ پھر وہی محنت کش عوام کو مختلف کاموں میں لگا کر پیداوار حاصل کرے گی اور وہی اس حاصل شدہ پیداوار کو محنت کرنے والوں کے درمیان ایک خاص تناسب سے تقسیم کرے گی۔

یہ تجویز بڑے زور وشور کے ساتھ پیش کی گئی اور کہا گیا کہ اس طریقِ کار میں مزدور اور کسان کے ہر دکھ کا علاج ہے، لیکن نتائج پر غور کیجیے کہ اس نظامِ معیشت نے نہ صرف یہ کہ کچھ نئی مشکلات کھڑی کردیں، بلکہ مزدور کی پرانی مصیبتیں بھی تقریباً اسی طرح برقرار ہیں، تھوڑی دیر کے لیے اس بات سے قطع

نظر کر لیجیے کہ اس تجویز کو عملی طور سے نافذ کرنے میں کتنی مشکلات ہیں؟ اس بحث کو بھی جانے دیجیے کہ یہ نظام شدید ترین ڈکٹیٹر شپ کے بغیر نہیں چل سکتا، اس پہلو کو بھی کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیجیے کہ اس سے بسا اوقات مزدور اور کسان کو اس کام پر مجبور ہونا پڑتا ہے جو وہ اپنی افتادِ طبع کے تحت نہیں کرنا چاہتا، اس واقعے کو بھی بالائے طاق رکھیے کہ اس نظام میں جبری محنت اور بیگار کیمپ مزدور پر کیا ظلم ڈھاتے ہیں؟ اس بات کو بھی مت سوچیے کہ اس نظام میں مذہب واخلاق کا کیا حشر ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظام میں بھی جو خالص مزدور اور کسان ہی کے نام پر ابھرا ہے، ملک کی دولت سے عام آدمی کو کتنا حصہ مل سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والی یہ پارٹی جس میں محنت کش عوام کے بمشکل پانچ فی صد افراد شریک ہوتے ہیں، کوئی فرشتوں کی جماعت تو نہیں ہوتی، اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک انفرادی سرمایہ دار کی نیت مزدور کے حق میں خراب ہوسکتی ہے تو اس پارٹی کی نیت کیوں خراب نہیں ہوسکتی؟ اگر ایک شخص بڑے کارخانے کا صرف مالک ہوکر اپنے زیر دستوں پر ظلم ڈھا سکتا ہے تو یہ پارٹی ملک کی ساری زمینوں، سارے کارخانوں اور ساری دولت پر قابض ہوکر اپنے زیر دستوں کے حقوق پر کیوں ڈاکہ نہیں ڈال سکتی؟

واقعہ یہ ہے کہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار تو بے شک ختم ہوجاتے ہیں، لیکن ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجاتا ہے جو دولت کی اس وسیع جھیل کو من مانے طریقے سے استعمال کر سکتا ہے۔ چنانچہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ محنت کش عوام میں تقسیم ہوتا ہے اور باقی ساری دولت حکمران جماعت کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ بیرونی دنیا تو یہی دیکھتی ہے کہ

اشتراکی ملک کی صنعت وتجارت دنیا پر چھا رہی ہے، وہاں مصنوعات اور ایجادات کی بہتات ہے اور وہاں کے مصنوعی سیارے ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، لیکن اس بات کو سوچنے والے کم ہوتے ہیں کہ وہاں محنت کش عوام کو ان ترقیات کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے اور دولت کے عظیم الشان ذخیروں میں سے انہیں کتنا حصہ مل رہا ہے؟ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سرمایہ دار ممالک میں ترقی کا مطلب چند سرمایہ داروں کی ترقی ہے اسی طرح اشتراکی نظام میں بھی ترقی ایک خاص طبقے کی ترقی سے عبارت ہے، رہا بے چارہ عام مزدور اور کسان، سو وہ دونوں جگہ صرف اتنی اجرت کا مستحق ہوتا ہے جتنی اس کے ''آقا'' اسے دینا چاہیں، فرق اتنا ہے کہ وہاں اسے اجرت اگر کم محسوس ہوتی تھی تو وہ ہڑتال، احتجاج اور پیشے کی تبدیلی کے ذریعے اپنے آنسو دھونے کی کوشش کر لیتا تھا، لیکن یہاں اسے اپنی کسی حق تلفی پر کراہنے کی بھی اجازت نہیں، شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے اسی لیے کہا تھا ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس کے برعکس اسلام کے عدلِ عمرانی شاہراہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے بیچ سے گزرتی ہے، اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز خواہ زمین اور کارخانے کی شکل میں ہو یا روپے پیسے اور اشیائے صرف کی شکل میں ہو، اصل میں اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی ملکیت میں ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱)

آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے۔

ہاں وہ اپنی یہ ملکیت نفع اٹھانے کے لیے بندوں کو دے دیتا ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۲)

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنادیتا ہے۔

جب انسان کے ہاتھ میں ہر چیز اللہ کی دی ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اللہ کی مرضی کا پابند ہوگا، اس کے ذریعے دوسروں پر ظلم ڈھا کر زمین میں فساد برپا کر دینا اللہ کو کسی طرح گوارہ نہیں، انسان کا کام یہ ہے کہ دوسروں کا خون چوسنے کے بجائے اپنی اصل منزلِ مقصود یعنی آخرت کو پیش نظر رکھ کر دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ط (۳)

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعے تم دارِ آخرت (کی بھلائی) تلاش کرو اور دنیا سے جو حصہ تمہیں

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۸٤)۔
(۲) سورۃ الاعراف آیت (۱۲۸)۔
(۳) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

ملا ہے اسے نہ بھولو اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا
ہے تم دوسروں پر احسان کرو اور زمین میں فساد پھیلانے کی
کوشش نہ کرو۔"

ان ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے انفرادی طور سے ملکیت عطا تو کی ہے، لیکن یہ ملکیت آزاد، خود مختار، خودغرض اور بے لگام نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دیے ہوئے احکام کی پابند ہے، اس کو انسان اپنے جائز نفع کے لیے تو استعمال کرسکتا ہے، لیکن اس کے ذریعے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام کی جتنی خرابیوں اور اس کی جتنی ناانصافیوں پر آپ نظر ڈالیں گے بنیادی طور سے ان کے چار ہی سبب نظر آئیں گے، سود، قمار، سٹہ اور اکتناز، سرمایہ دار ایک طرف تو سود، قمار اور سٹہ کے ذریعے ساری قوم کی دولت کھینچ کھینچ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، دوسری طرف اس کے کھانے میں کسی غریب، مفلس، اپاہج یا بے سہارا انسان پر لازمی طور سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی مد نہیں، وہ خود اپنی شرافت سے کسی کو کچھ دے دے تو اس کا احسان ہے ورنہ ایسے اخراجات کی کوئی پابندی اس پر نہیں ہے۔

اسلام نے اولاً تو آمدنی کے ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کردیا، سود، قمار، سٹہ کے ذریعے دولت حاصل کرنے کو بدترین جرم قرار دے کر صاف صاف اعلان کردیا کہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۱)

(۱) سورۃ النساء آیت (۲۹)۔

اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقے سے مت کھاؤ، الّا یہ کہ تمہاری باہمی رضامندی سے کوئی تجارت ہو۔

سود میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کاروبار کرنے والے کو نقصان ہوجائے تو سارا نقصان اس پر پڑتا ہے اور قرض دینے والے کا سود ہر حال میں کھرا رہتا ہے اور اگر نفع ہوجائے تو سارا نفع وہ لے اڑتا ہے اور قرض دینے والے کو اس کا چالیسواں حصہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح دولت پھیلنے کے بجائے سکڑتی ہے اور ہموار طریقے سے گردش نہیں کرسکتی۔ اسلام نے اس کے بجائے شرکت ومضاربت کی صورت تجویز کی ہے، جس میں نفع ہوتو فریقین کا ہو اور نقصان ہوتو دونوں اسے برداشت کریں۔

قمار اور سٹہ میں بھی ساری قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ ایک جگہ جمع ہوجاتا ہے، پھر ایک عام آدمی کا روپیہ یا تو اس جیسے ہزاروں غریب آدمیوں کی جیب سے ایک ایک روپیہ کھینچ کر اس کے پاس جمع کردیتا ہے یا خود بھی کسی سرمایہ دار کی جیب میں جاگرتا ہے۔ غرض دونوں ہی صورتوں میں روپیہ سمٹتا ہے اور اس کی فطری گردش رک جاتی ہے۔ اسلام نے اس پر اور کاروبار کے ایسے تمام طریقوں پر پابندی بٹھادی ہے جس میں ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو یا جس سے پورے معاشرے کی دولت ایک جگہ سمٹنے لگے۔

آمدنی کے ناجائز ذرائع پر پابندی لگانے کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لیے اسلام نے سرمایہ دار پر زکوۃ جیسے بہت سے اخراجات واجب کردیے ہیں جو اس کا احسان نہیں، بلکہ اس مال پر واجب ہونے

والا حق ہے، جسے بزورِ قانون وصول کیا جاسکتا ہے۔ زکوۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقۂ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت اور وراثت وہ چھوٹی بڑی مدات ہیں جن کے ذریعے دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

ان قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیتِ مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خودغرضی کے بجائے ہمدردی، فراخ حوصلگی، سخاوت اوراس سے بڑھ کر خوفِ خدا اور فکرِ آخرت پر استوار ہوئی ہے، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے عائد ہونے والے قانونی فرائض کی ادائیگی پر بس کرلے اور اس کے بعد دوسروں کے دکھ درد سے آنکھیں بند کرکے بیٹھ جائے، اس کی زندگی کے ہر ہر مرحلے پر تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یہ دنیا چند دنوں کی بہار ہے، عیش و مسرت روپے اور پیسے کے اس ڈھیر کا نام نہیں ہے جو یہاں جمع کرلیا جائے، بلکہ روح کے اس سکون اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جو اپنے کسی بھائی کے چہرے پر خوش حالی کی مسکراہٹ دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور جس سے آخرت کی آنے والی زندگی میں مسرتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔

چنانچہ قرآن وحدیث کو دیکھیے، ان کی تعلیمات ”انفاق فی سبیل اللہ“ کی ہدایت سے بھری پڑی ہیں اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (۱)

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۱۹)۔

"لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرمادیجیے جو ضرورت سے زائد ہو"۔

غرض ایک طرف سرمایہ دار کی آمدنی کی ناجائز مدات کو ختم کرکے اور دوسری طرف اس کے اخراجات میں اضافہ کرکے اسلام نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے، افسوس ہے کہ آج کی دنیا میں یہ ساری باتیں نرا "نظریہ" ہوکر رہ گئی ہیں اور عملی طور سے معیشت کا یہ بے داغ اور صاف ستھرا نظام دنیا میں کہیں نافذ نہیں ہے، لیکن اگر اس نظام کے عملی نتائج دیکھنے ہوں تو تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور کا مطالعہ کیجیے، جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لے کر نکلا کرتا تھا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

ہماری زبوں حالی

اب ہماری شومئ اعمال ہے کہ اتنا پر امن وسکون نظام رکھنے کے باوجود شروع میں تو ہم نے اپنی معیشت کا نظام سرمایہ داری کے اصولوں پر بنایا، اب جب اس کے نقصانات سامنے آرہے ہیں تو ہم میں سے بعض لوگوں نے اشتراکیت اور سوشلزم کی آوازیں بلند کرنی شروع کردی ہیں، پہلے سرمایہ داری کی بدترین لعنتوں اور سود اور قمار وغیرہ کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں قرآن وسنت کی تحریف کی جاتی تھی۔ اب سوشلزم کو اسلامی بنانے کے لیے آیات واحادیث کی الٹی سیدھی تاویلیں کی جارہی ہیں اور ذہن اگر نہیں چلتا تو اس طرف کہ مغربی افکار کی غلامی کو ایک مرتبہ دل سے نکال کر سیدھے سچے طریقے سے اسلامی اصولوں پر غور کرلیا جائے کہ وہ موجودہ مشکلات کا واقعی طور

سے کیا حل پیش کرتے ہیں۔

جو حضرات غلط فہمی سے سرمایہ داری یا اشتراکیت کو اپنے لیے راہِ نجات سمجھ بیٹھے ہیں، ہم نہایت دردمندی کے ساتھ ان سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام میں اسلام کا پیوند لگانے کے بجائے ٹھنڈے دل ودماغ سے معقولیت کے ساتھ اسلامی احکام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک آزاد اسلامی مملکت میں مسلمان کا حقیقی منصب یہ ہے کہ پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے نہ صرف خود اسلام کا عملی نمونہ بنے، بلکہ دنیا بھر کو دعوت دے کہ تم افراط وتفریط کی کسی بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہو، انسانیت کی فلاح کی منزل اس راستے پر چلے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی جو چودہ سو سال پہلے انسانیت کے محسنِ اعظم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دکھایا تھا

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اُو نرسیدی، تمام بولہبی است

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
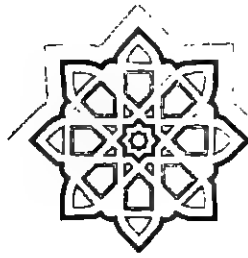
اسلام
اور
جدید اقتصادی مسائل

(اصلاحی خطبات ۳/۲۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام اور جدید اقتصادی مسائل

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا ومولانا محمد النبي الامين وعلى آله وأصحابه أجمعين وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين۔
أما بعد!

آج کا موضوع

جنابِ صدر و معزز خواتین و حضرات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج کی اس نشست کا موضوع ''اسلام اور جدید اقتصادی مسائل'' رکھا گیا ہے اور اس پر گفتگو کرنے کے لیے مجھ ناکارہ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں اس موضوع کے بنیادی خدّوخال آپ حضرات کی خدمت میں پیش کروں۔

یہ موضوع درحقیقت بڑا طویل الذیل اور تفصیل طلب موضوع ہے، جس کے لیے ایک گھنٹے کی وسعت نہایت ناکافی ہے، بلکہ مجھے یہاں ''ناکافی'' کا لفظ بھی ناکافی معلوم ہورہا ہے اس لیے تمہید سے قطع نظر براہ راست اصل موضوع

کی طرف آنا چاہتا ہوں تاکہ اس مختصر وقت میں اپنی بساط کے مطابق اس موضوع کے چند خدوخال آپ حضرات کی خدمت میں عرض کردوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع نہ صرف یہ کہ ایک گھنٹے کا موضوع نہیں ہے، بلکہ ایک نشست کا موضوع بھی نہیں ہے، اس پر بڑی طویل کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں اور ایک مختصر نشست میں اس کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جدید اقتصادی مسائل اتنے زیادہ اور اتنے متنوع ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کا انتخاب کرکے اس پر بات کی جائے اور دوسرے مسائل کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی ایک مشکل آزمائش ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ جزوی اقتصادی مسائل پر گفتگو کی جائے، میں اسلام کی اقتصادی اور معاشی تعلیمات کا بنیادی اور اصولی خاکہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ کم از کم اسلامی معیشت کے بنیادی تصوّرات ذہن نشین ہوجائیں، کیونکہ جتنے جزوی اقتصادی مسائل ہیں جن کی طرف مجھ سے پہلے ڈاکٹر اختر سعید صاحب نے اشارہ فرمایا ہے، وہ سارے کے سارے اقتصادی مسائل درحقیقت بنیادی تصوّرات پر مبنی ہوں گے اور ان کا جو حل بھی تلاش کیا جائے گا وہ انہی بنیادی تصوّرات کے ڈھانچے میں تلاش کیا جائے گا۔

لہٰذا سب سے پہلے اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے ذہن میں اسلامی معیشت کا تصوّر واضح ہو اور یہ بات معلوم ہو کہ اسلامی معیشت کس چیز کا نام ہے؟ اس کی کیا بنیادی خصوصیات ہیں؟ اور کس طرح دوسری معیشتوں سے ممتاز ہے؟ جب تک یہ بات واضح نہ ہو اس وقت تک اقتصادی مسائل پر گفتگو یا بحث یا ان کا کوئی حل منطقی طور پر درست نہیں ہوگا، اس لیے میں اس وقت مختصراً اسلامی معیشت کے بنیادی تصوّرات اور آج کی دنیا میں

جاری معیشت کے نظام کے ساتھ اس کا تقابل اور موازنہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائیں اور اس مختصر وقت میں اس اہم موضوع کو صحیح طور پر بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اسلام ایک نظامِ زندگی ہے

سب سے پہلی بات جو اسلامی معیشت کے حوالے سے یاد رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت ان ٹھیٹھ معنوں میں ایک ''معاشی نظام'' نہیں جن معنوں میں آج کل معاشی نظام کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جو اس کے معنی سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جس کا ایک اہم شعبہ معیشت اور اقتصاد بھی ہے، لیکن پورے اسلام کو ایک معاشی نظام کی حیثیت میں متعارف کرانا یا اسلام کو ایک معاشی نظام سمجھنا درست نہیں، جیسے کیپٹل ازم ہے یا سوشلزم ہے، لہٰذا جب ہم اسلام کی معیشت کا نام لیتے ہیں یا اسلامی معیشت کے تصوّرات اور اس کی بنیادوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ قرآنِ کریم میں اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں معیشت کے اسی طرح نظریات ہوں گے جو آدم اسمتھ اور مارشل اور دوسرے ماہرینِ معاشیات کی کتابوں میں موجود ہیں کیونکہ اسلام اپنی ذات اور اصل میں ایک معاشی نظام نہیں، بلکہ وہ ایک نظامِ زندگی ہے جس کا ایک چھوٹا سا شعبہ معیشت بھی ہے، اس پر اسلام نے اہمیت ضرور دی ہے، لیکن اس کو مقصدِ زندگی قرار نہیں دیا، اس لیے جب میں آگے آپ حضرات کی خدمت میں معیشت کی بات کروں گا تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن اور سنت میں اگر کوئی شخص اس طرح کے معاشی نظریات ان اصطلاحوں

اور ان تصوّرات کے تحت تلاش کرے گا جس تصوّرات اور اصطلاحات کے ساتھ معیشت کی عام کتابوں میں ملتے ہیں تو اس طرح کے تصوّرات ان میں نہیں ملیں گے، البتہ اسلام کے اندر وہ بنیادی تصوّرات انسان کو ملیں گے جن پر بنیاد رکھ کر ایک معیشت کی تعمیر کی جاسکتی ہے، اس لیے میں اپنی ذاتی گفتگو اور تحریروں میں بھی ''اسلام کا معاشی نظام'' کے بجائے ''اسلام کی معاشی تعلیمات'' کا لفظ استعمال کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں، اسلام کی ان معاشی تعلیمات کی روشنی میں معیشت کی کیا شکل ابھرتی ہے؟ اور کیا ڈھانچہ سامنے آتا ہے؟ یہ سوال ایک معیشت کے طالبِ علم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

''معیشت'' زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ معیشت بے شک اسلامی تعلیمات کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اور معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگر اسلامی فقہ کی کسی بھی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کے دو حصے معیشت سے متعلق ہوں گے۔ آپ نے فقہ کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' کا نام ضرور سنا ہوگا، اس کی چار جلدیں ہیں جس میں سے آخری دو جلدیں تمام تر معیشت کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ اس سے آپ اسلام کی معاشی تعلیمات کی وسعت کا اندازہ کرسکتے ہیں، لیکن یہ بات ہر وقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ دوسرے معاشی نظاموں کی طرح اسلام میں معیشت انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے، جتنی سیکولر معیشتیں ہیں ان میں معیشت کو انسان کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر تمام نظام کی تعمیر کی گئی ہے، لیکن اسلام میں معیشت اہمیت ضرور رکھتی ہے، لیکن وہ انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔

اصل منزل آخرت ہے

اسلام کی نظر میں بنیادی مسئلہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا جس کے اندر انسان آیا ہے یہ اس کی آخری منزل اور آخری مطمح نظر نہیں ہے، بلکہ یہ آخری منزل تک پہنچانے کے لیے ایک مرحلہ ہے اور ایک عبوری دور ہے اس عبوری دور کو بھی یقیناً اچھی حالت میں گزارنا چاہیے، لیکن یہ سمجھنا کہ میری ساری کوششوں، ساری توانائیوں اور ساری جدوجہد کا محور یہ دنیاوی زندگی کی معیشت ہوجائے، یہ بات اسلام کے بنیادی مزاج سے میل کھانے والی نہیں۔

اسلام نے ایک طرف دنیا کو اس درجے اہمیت دی کہ دنیاوی منافع کو قرآنِ کریم میں "خیر" اور "اللہ کا فضل" کہا گیا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة"(۱)

(۱) السنن الكبرى للبيهقى ٢١١/٦ (١١٦٩٥) والمعجم الكبير للطبرانى ٧٤/١٠ (٩٩٩٣)۔ وأورده الهيثمي في "المجمع" ٥٢٠/١٠ (١٨٠٩٨) وقال: رواه الطبراني، وفيه عباد بن كثير الثقفي، وهو متروك. وذكره السخاوي في "المقاصد الحسنة" ص٣١٦ (٨٠١) وقال: الطبراني، والبيهقي في "الشعب"، والقضاعي، من جهة عباد بن كثير، عن الثوري، عن منصور، عن إبراهيم، عن علقمة، عن ابن مسعود، به، مرفوعًا، وقال البيهقي: تفرد به عباد، وهو ضعيف، قال أبو أحمد الفراء: سمعت يحيى بن يحيى يسأل عن حديث عباد في الكسب، فإذا انتهى إلى رسول الله ﷺ قال: إن كان قاله، وله شواهد، منها عن ابن مسعود مرفوعًا، أخرجه الطبراني، وعن أنس رفعه ولفظه: "طَلَبُ الحلَالِ وَاجِبٌ عَلى كُلِّ مُسْلِمٍ"، أخرجه الطبراني في "الأوسط"، والديلمي، وعن ابن عباس مرفوعًا: "طَلَبُ الحلَالِ جِهَادٌ"، رواه القضاعي من حديث محمد بن الفضل عن ليث بن أبي سليم عن مجاهد عنه، وهو عند أبي نعيم في "الحلية"، ومن طريقه الديلمي عن ابن عمر، وبعضها يؤكد بعضًا، لا سيما وشواهدها كثيرة.

یعنی معیشت کو حلال طریقے سے حاصل کرنا یہ انسان کے فرائض کے بعد دوسرے درجے کا اہم فریضہ ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ اپنی تمام جدوجہد کا محور اس دنیا کو نہ بنانا، کیونکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری ابدی زندگی آخرت کی شکل میں آنے والی ہے، اس کی بہبود درحقیقت انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔

دنیا کی بہترین مثال

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے اس نقطۂ نظر کو ایک خوبصورت مثال سے واضح فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

آب اندر زیرِ کشتی پشتی است
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است

دنیا کی مثال پانی جیسی ہے اور انسان کی مثال کشتی جیسی ہے، جس طرح کشتی بغیر پانی کے نہیں چل سکتی اسی طرح انسان دنیا اور اس کے ساز و سامان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن یہ پانی کشتی کے لیے اس وقت تک فائدہ مند ہے جب تک وہ کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد ہو، لیکن اگر یہ پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو اس وقت وہ پانی کشتی کو سہارا دینے کے بجائے اسے ڈبو دے گا۔ اسی طرح دنیا کے یہ سارے ساز و سامان انسان کے لیے بڑے فائدہ مند ہیں اور اس کے بغیر انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی، لیکن یہ اس وقت تک فائدہ مند ہیں جب تک یہ دل کی کشتی کے چاروں طرف اور اردگرد رہیں، لیکن اگر یہ ساز و سامان انسان کی دل کی کشتی میں سوار ہوجائیں تو پھر وہ انسان کو ڈبو دیں

گے اور ہلاک کردیں گے۔

اسلام کا معیشت کے بارے میں یہی نقطۂ نظر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ معیشت فضول چیز ہے، اس لیے کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ معیشت بڑی کارآمد چیز ہے بشرطیکہ اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے اور اس کو اپنا بنیادی مطمح اور آخری مقصدِ زندگی قرار نہ دیا جائے۔

ان دو بنیادی نکتوں کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ اور ان بنیادی معاشی مسائل کو موجودہ معاشی نظاموں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت نے کس طرح حل کیا ہے؟ اور پھر تیسرے نمبر پر یہ کہ اسلام نے ان کو کس طرح حل کیا ہے؟

”معیشت کا مفہوم“

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ معاشیات کا ایک مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ کسی معیشت کے بنیادی مسائل چار ہیں۔ ان چار مسائل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ ہم جس چیز کو اکنامکس (Economics) کہتے ہیں اور عربی میں جس کا ترجمہ ”اقتصاد“ سے کیا جاتا ہے، اگر ڈکشنری میں اس کے لغوی معنی دیکھے جائیں تو اکنامکس کے معنی یہ ملیں گے کہ انسان اپنی ضروریات کو کفایت سے پورا کرلے۔ اکنامکس کے اندر بھی کفایت کا تصور موجود ہے اور عربی میں اس کا جو ترجمہ اقتصاد سے کیا جاتا ہے اس میں بھی کفایت کا تصور موجود ہے۔ لہٰذا اکنامکس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات، بلکہ

خواہشات غیر متناہی ہیں اور ان ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے وسائل کم اور محدود ہیں، اگر وسائل بھی اتنے ہی ہوتے جتنی ضروریات اور خواہشات ہیں تو پھر کسی علمِ معاشیات کی ضرورت نہ ہوتی۔ علمِ معاشیات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات زیادہ ہیں اور اس کے مقابلے میں وسائل کم ہیں، تو اب اس کی ضرورت پیش آئی کہ کس طرح ان دونوں کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے؟ جس کے ذریعے کفایت کے ساتھ اپنی ضروریات اور خواہشات پوری ہوسکیں اور یہی درحقیقت علمِ معاشیات کا موضوع ہے اور اس نقطہ نظر سے کسی معیشت کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ چار بنیادی مسائل ہیں۔

ترجیحات کا تعین (Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جس کو معیشت کی اصطلاح میں ''ترجیحات کا تعین'' کہا جاتا ہے یعنی ایک انسان کے پاس وسائل تو تھوڑے سے ہیں اور ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں۔ اب کون سی خواہش کو مقدم کرے اور کون سی خواہش کو مؤخر کرے، یہ معاشیات کا سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں، اب ان پچاس روپے میں خوراک کے لیے بازار سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں اور اس پچاس روپے سے کپڑا بھی خرید سکتا ہوں اور کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے میں بھی خرچ کرسکتا ہوں اور ان پچاس روپے سے کوئی فلم بھی دیکھ سکتا ہوں۔ اب یہ چار پانچ ضرورتیں میرے سامنے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چار پانچ اختیارات میں سے کس کو ترجیح دوں؟ اور وہ پچاس روپے کس طرح استعمال کروں؟ اس مسئلے کا نام ''ترجیحات کا تعین'' ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے اسی طرح پورے ملک، پوری ریاست اور پوری معیشت کو بھی پیش آتا ہے، مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں، کچھ انسانی وسائل ہیں، کچھ معدنی وسائل ہیں، کچھ نقدی وسائل ہیں، یہ سارے وسائل محدود ہیں اور ہماری ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں۔ اب جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کے ذریعے ہم کھیت میں گندم بھی اگا سکتے ہیں، چاول بھی اگا سکتے ہیں اور تمباکو بھی اگا سکتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سارے وسائل عیاشی پر خرچ کردیں۔ یہ مختلف اختیارات (options) ہمارے سامنے موجود ہیں تو کسی معیشت کا سب سے پہلا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ترجیحات کا تعین کس طرح کریں؟ اور کس کام کو فوقیت دی جائے؟

۲۔ ''وسائل کی تخصیص''

دوسرا مسئلہ جسے معاشیات کی اصطلاح میں ''وسائل کی تخصیص'' (Allocation of resources) کہا جاتا ہے، یعنی جو وسائل ہمارے پاس موجود ہیں ان کو کس کام میں کس مقدار میں لگایا جائے؟ مثلاً ہمارے پاس زمینیں بھی ہیں اور ہمارے پاس کارخانے بھی ہیں، ہمارے پاس انسانی وسائل بھی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کتنی زمین پر گندم اگائیں؟ اور کتنی زمین پر روئی اگائیں؟ کتنی زمین پر چاول اگائیں؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں وسائل کی تخصیص کہا جاتا ہے کہ کون سے وسیلے کو کس کام کے لیے اور کس مقدار میں مخصوص کیا جائے؟

۳۔ آمدنی کی تقسیم

تیسرا مسئلہ ہے کہ جب پیداوار (Production) شروع ہو تو اس

پیداوار کو کس طرح معاشرے اور سوسائٹی میں تقسیم کیا جائے؟ اس کو معیشت کی اصطلاح میں آمدنی کی تقسیم (Distribution of Wealth) کہا جاتا ہے۔

۴۔ ترقی

چوتھا مسئلہ جس کو معاشیات کی اصطلاح میں ''ترقی'' (Development) کہا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہماری جو معاشی سرگرمیاں ہیں ان کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تاکہ جو پیداوار حاصل ہورہی ہے وہ معیار کے اعتبار سے اور زیادہ اچھی ہوجائے اور مقدار کے لحاظ سے زیادہ ہوجائے اور اس میں ترقی ہو اور نئی مصنوعات وجود میں آئیں، تاکہ مزید اسبابِ معیشت لوگوں کے سامنے آئیں۔

یہ چار اسبابِ معیشت ہوتے ہیں جس کا ہر معیشت کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان چار مسائل کے تعین کے بعد ایک نظر اس پر ڈالنی ہوگی کہ موجودہ رائج الوقت معیشت کے نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟ پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اسلام ان مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے کیونکہ عربی کا یہ مصرعہ آپ نے سنا ہوگا کہ

وبضدها تتبين الأشياء

جب تک کسی چیز کی ضد سامنے نہ آئے اس وقت تک کسی چیز کے حقیقی محاسن سامنے نہیں آتے، اگر رات کا اندھیرا نہ ہوتو دن کی روشنی کی قدر نہ ہوتی، اگر حبس اور گرمی نہ ہوتو بارش کا رحمت ہونا معلوم نہ ہوتا۔ اس لیے مختصراً پہلے یہ جائزہ لینا ہوگا کہ رائج الوقت معاشی نظاموں نے ان چار مسائل کو کس طرح حل کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام میں ان کا حل

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کو لیا جاتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام نے ان چار مسائل کو حل کرنے کے لیے جو فلسفہ پیش کیا وہ یہ ہے کہ ان چار مسائل کو حل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، ایک ہی جادو کی چھڑی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دو اور پھر جب ہر شخص اپنا منافع کمانے کی فکر کرے گا اور آزاد جدوجہد کرے گا تو اس وقت یہ چاروں مسائل خود بخود (Automatically) حل ہوتے چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ چار مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اس کائنات میں قدرتی قوانین کارفرما ہیں، جس کو رسد اور طلب (Supply and Demand) کے قوانین کہا جاتا ہے۔ معاشیات کے طالب علم کے علاوہ ہر عام آدمی بھی ان قوانین کے بارے میں اتنا جانتا ہے کہ جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اگر طلب رسد کے مقابلے میں کم ہو تو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ بازار میں آم موجود ہیں اور آم کے خریدار اور شوقین زیادہ ہیں اس کے مقابلے میں اس کی سپلائی کم ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں آم کی قیمت بڑھ جائے گی، لیکن اگر وہ آم ایسے علاقے میں پہنچا دیے جائیں جہاں لوگ آم کھانا پسند نہیں کرتے اور ان کے اندر آم کھانے کی طلب اور رغبت نہیں ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آم کی قیمت گھٹ جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے اور اور طلب کے گھٹنے سے قیمت گھٹتی ہے۔ یہ ایک عام اصول اور قانون ہے جسے ہر انسان جانتا ہے۔

سرمایہ دارانہ (Capitalism) نظریہ کہتا ہے کہ یہی قانون جو درحقیقت اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کس مقدار میں پیدا کی جائے اور کس طرح وسائل کی تخصیص کی جائے، ان سب چیزوں کا تعین درحقیقت طلب ورسد کے قانون سے ہوتا ہے، اس لیے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو اب ہر شخص اپنے منافع کی خاطر وہی چیز پیدا کرنے کی کوشش کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب زیادہ ہے۔

میں آج اگر ایک کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں تو پہلے میں یہ معلوم کروں گا کہ بازار میں کس چیز کی طلب زیادہ ہے تاکہ وہ چیز مارکیٹ میں لاؤں تو اس کو زیادہ قیمت میں فروخت کرکے اپنا منافع کماسکوں۔

لہٰذا لوگ جب اپنے منافع کے محرک کے تحت کام کریں گے تو وہی چیز بازار میں لائیں گے، جس کی طلب زیادہ ہوگی اور جب بازار میں اس چیز کی طلب کم ہوجائے گی تو لوگ اس پیداوار کو بازار میں مزید لانے سے اس لیے رک جائیں گے کہ مزید لانے کی صورت میں اس کی قیمت گھٹے گی اور قیمت گھٹنے سے ان کا نقصان ہوگا یا کم از کم منافع پورا نہیں کماسکیں گے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ طلب ورسد کے قوانین مارکیٹ میں اس طرح جاری ہیں کہ اس کے ذریعے ترجیحات کا تعین بھی خود بخود ہوجاتا ہے کہ کیا چیز پیدا کی جائے اور کتنی مقدار میں پیدا کی جائے اور وسائل کی تخصیص بھی اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ انسان

اپنی زمین اور اپنے کارخانے کو اس چیز کے پیدا کرنے میں استعمال کریں گے جس کی طلب ملک میں زیادہ ہے تاکہ اس سے زیادہ منافع حاصل کر سکے، لہٰذا منافع کے حصول کے محرک کے ذریعے ان چاروں مسائل کو حل کیا جاتا ہے، اس کی بنیاد رسد وطلب کے بنیادی قوانین ہوتے ہیں اور اس سسٹم کو پرائز میکنزم (Price mechanism) کہا جاتا ہے اور اسی پرائز میکنزم کے تحت یہ سارے وسائل انجام پاتے ہیں۔

اسی طرح آمدنی کی تقسیم کا نظام ہے۔ اس کے بارے میں سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ یہ ہے کہ رسد وطلب کے قوانین ہی کے تحت آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کارخانہ دار نے ایک کارخانہ لگایا اور اس میں ایک مزدور کو کام پر لگایا، اب سوال یہ ہے کہ کارخانے سے ہونے والی آمدنی کا کتنا حصہ مزدور وصول کرے اور کتنا کارخانے دار حاصل کرے؟ اس کا تعین بھی در حقیقت رسد اور طلب کے قوانین کے تحت ہوگا، یعنی مزدور کی طلب جتنی زیادہ ہوگی اس کی اجرت بھی اتنی زیادہ ہوگی اور جتنی اس کی طلب کم ہوگی اس کی اجرت بھی کم ہوجائے گی تو اسی اصول پر آمدنی کی تقسیم ہوگی۔

آخری مسئلہ یعنی ترقی (Development) کا مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوگا کہ جب ہر شخص زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی فکر میں ہے تو اب وہ منافع کے حصول کے لیے نت نئی ایجادات سامنے لائے گا اور ایسی چیزیں پیدا کرے گا جس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف راغب کر سکے۔

لہٰذا جب ہر شخص کو منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے ذریعے چاروں مسائل خود بخود حل ہوجاتے ہیں، انہی کے ذریعے ترجیحات کا تعین

ہوتا ہے، انہی کے ذریعے وسائل کی تقسیم ہوتی ہے، انہی کی ذریعہ آمدنی کی تقسیم ہوتی ہے، اور انہی کے ذریعے معاشی ترقی عمل میں آتی ہے، یہ سرمایہ دارانہ نظریہ ہے۔

اشتراکیت میں ان کا حل

جب اشتراکیت میدان میں آئی تو اس نے کہا کہ جناب! آپ نے معیشت کے سارے اہم اور بنیادی مسائل کو بازار کی اندھی اور بہری قوتوں کے حوالے کردیا ہے، اس لیے کہ رسد وطلب کی قوتیں اندھی بہری قوتیں ہیں اور یہ جو آپ نے کہا کہ انسان وہی چیز پیدا کرے گا جس کی مارکیٹ میں طلب ہے اور اسی وقت تک پیدا کرے گا جب تک مارکیٹ میں طلب ہوگی۔ یہ بات نظریاتی طور پر تو چاہے درست ہو، لیکن عملی میدان میں جب انسان قدم اٹھاتا ہے تو اس کو اس بات کا علم بہت مدت کے بعد ہوتا ہے کہ اس چیز کی طلب کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی، ایک مدت ایسی آتی ہے جس میں طلب حقیقتاً گھٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن پیدا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ طلب بڑھی ہوئی ہے اس لیے وہ پیداوار میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے جس کے نتیجے میں بالآخر کساد بازاری پیدا ہوتی ہے اور پھر کساد بازاری کے مہلک نتائج معیشت کو بھگتنا پڑتے ہیں، لہٰذا ان مسائل کو ان اندھی بہری قوتوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے ایک جادو کی چھڑی پیش کی تھی اور اشتراکیت نے دوسری جادو کی چھڑی پیش کردی کہ ان چاروں مسائل کا ایک ہی حل ہے وہ یہ کہ سارے وسائلِ پیداوار انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی ملکیت میں لائے جائیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ سارے وسائلِ پیداوار حکومتی تحویل میں

دے دیے جائیں اور پھر حکومت ان وسائل کی منصوبہ بندی کرے گی کہ کتنی زمین پر گندم اگائی جائے، کتنی زمین پر چاول پیدا کیا جائے، کتنی زمین پر روئی پیدا کی جائے، کتنے کارخانوں میں کپڑا بنے گا اور کتنے کارخانوں میں جوتے بنیں گے، یہ ساری پلاننگ حکومت کرے گی اور جو انسان زمین یا کارخانے میں کام کریں گے ان کی بحیثیتِ محنت کار اجرت مہیا کی جائے گی اور اس اجرت کی مقدار بھی پلاننگ کے ذریعے طے کی جائے گی، لہٰذا ترجیحات کا تعین بھی حکومت کرے گی، وسائل کی تخصیص بھی حکومت کرے گی، آمدنی کی تقسیم بھی حکومت کرے گی اور ترقی کی منصوبہ بندی بھی حکومت کرے گی۔

چونکہ اشتراکی معیشت میں یہ سارے کام حکومت اور منصوبہ بندی کے حوالے کیے گئے ہیں اس لیے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) بھی کہتے ہیں اور سرمایہ دارانہ معیشت نے چونکہ اپنے وسائل کو مارکیٹ کی رسد اور طلب کی قوتوں پر چھوڑ دیا ہے اس لیے اس کو بازاری معیشت (Market Economy) اور عدمِ مداخلت معیشت (Laissez-Free Economy) بھی کہتے ہیں۔

یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور دنیا میں رائج ہیں۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول

سرمایہ دارانہ معیشت کے بنیادی اصول جو اس کے فلسفے سے نکلتے ہیں ان میں پہلا اصول ''انفرادی ملکیت'' (Private ownership) یعنی تمام وسائل

پیداوار کا ہر شخص انفرادی طور پر مالک بن سکتا ہے۔ دوسرا اصول ''حکومت کی عدمِ مداخلت'' (Laiseez-Faire Policy of State) یعنی انسان کو منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے، حکومت کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے اور اس پر کوئی پابندی اور کوئی روک عائد نہ کی جائے۔ تیسرا اصول ''ذاتی منافع کا محرک'' ہے کہ انسان کے اپنے ذاتی منافع کو ایک محرک کے طور پر استعمال کیا جائے، معاشی سرگرمیوں میں تیزی لانے کے لیے اس کی ترغیب دی جائے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصول ہیں۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

اس کے برخلاف اشتراکیت کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ وسائل کی پیداوار کی حد تک ''انفرادی ملکیت'' کی بالکلیہ نفی کی جائے، یعنی وسائلِ پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتے، یعنی نہ کوئی زمین کسی کی ذاتی ملکیت ہوسکتی ہے اور نہ کارخانہ کسی کی ذاتی ملکیت ہوسکتا ہے۔ دوسرا اصول ہے ''منصوبہ بندی'' یعنی ہر کام پلاننگ اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے۔ یہ دو مختلف نظریات ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اشتراکیت کے نتائج

اس وقت دنیا میں ان دونوں نظاموں کے تجربات اور نتائج سامنے آچکے ہیں اور اشتراکیت کے نتائج آپ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ چوہتر سال کے تجربے کے بعد پورے نظام کی عمارت زمین پر اس طرح گر پڑی کہ بڑے بڑے سورما بچھڑے ہوئے نظر آئے، حالانکہ ایک زمانے میں

نیشنلائزیشن ایک فیشن کے طور پر دنیا میں رائج تھا اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف زبان کھولتا تو اس کو سرمایہ دار کا ایجنٹ اور رجعت پسند کہا جاتا تھا، لیکن آج خود روس کا سربراہ یہ کہہ رہا ہے کہ

’’کاش! یہ اشتراکیت کے نظریہ کا تجربہ روس کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے ملک میں کر لیا گیا ہوتا تاکہ کم ازکم ہم اس کی تباہ کاریوں سے بچ پاتے‘‘۔

اشتراکیت ایک غیر فطری نظام تھا

بہرحال! طبعی طور پر یہ ایک غیر فطری نظام تھا، اس لیے کہ دنیا میں بے شمار معاشرتی مسائل ہیں، صرف ایک معیشت ہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ اب اگر ان مسائل کو منصوبہ بندی کے ذریعے حل کرنے بیٹھ جائیں تو یقین کیجیے کبھی حل نہیں ہوسکیں گے، آخر یہ بھی تو ایک معاشرتی مسئلہ ہے کہ ایک مرد کو ایک عورت سے شادی کرنی ہے اور شادی کے لیے مرد کو مناسب بیوی درکار ہے اور بیوی کو مناسب شوہر چاہیے۔ اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ چونکہ شادی کا نظام لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں بڑی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں، طلاقیں ہورہی ہیں، گھر اجڑ رہے ہیں اور دونوں کے درمیان ناچاقیاں ہورہی ہیں، لہٰذا اس نظام کو چلانے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس نظام کو حکومت کے حوالے کردیا جائے اور پلاننگ کے ذریعے یہ طے کیا جائے کہ کون سا مرد کس عورت کے لیے مناسب ہے اور کون سی عورت کس مرد کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پلاننگ کے ذریعے اگر کوئی شخص اس مسئلے کو حل کرنا چاہے گا تو وہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہوگا، جس سے بہتر نتائج کی کوئی

امید نہیں ہوسکتی۔

یہی صورت حال اشتراکیت میں پیش آئی، اس میں چونکہ سارے مسائل پلاننگ اور منصوبہ بندی کے حوالے کیے گئے تو اب سوال یہ ہے کہ پلاننگ کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ حکومت کرے گی اور حکومت کیا چیز ہے؟ وہ چند فرشتوں کے مجموعے کا نام نہیں، بلکہ وہ بھی انسانوں ہی کے اندر سے وجود میں آنے والے گروپ کا نام ہے۔ اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ دار دولت کے بہت بڑے وسائل پر قبضہ کرکے من مانی کرتا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اشتراکیت کے نتیجے میں اگرچہ بہت سارے سرمایہ دار تو ختم ہوگئے، لیکن ایک بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا جس کا نام بیوروکریسی، افسر شاہی اور نوکر شاہی ہے اور اب سارے وسائلِ پیداوار اور ساری معیشت بیوروکریسی (افسر شاہی) کے ہاتھ میں آگئے، لہٰذا اب اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ ناانصافی نہیں کریں گے، وہ کون سے آسمان سے اترنے والے فرشتے ہیں یا وہ کون سی معصومیت کا پروانہ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ یقیناً اس نظام میں بھی خرابیاں ہوں گی اور وہ خرابیاں پیدا ہوئیں اور آپ حضرات نے دیکھ لیا اور یہ نظام اپنے انجام کو پہنچ گیا اور آج اس کا نام لینے والے بھی شرما شرما کر اس کا نام لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں

اب اشتراکیت کے فیل ہونے کے بعد آج سرمایہ دار مغربی ممالک بڑے زور وشور کے ساتھ بغلیں بجارہے ہیں کہ چونکہ اشتراکیت فیل ہوگئی ہے، لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہوگئی، اب انسان کے لیے سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ کوئی نظام کارآمد نہیں ہوسکتا اور اب یہ بات بالکل طے ہوچکی ہے۔

خوب سمجھ لیجیے کہ سرمایہ دارنہ معیشت کا جو بنیادی فلسفہ ہے وہ یہ آزاد بازار کا وجود اور لوگوں کو منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑنا اگرچہ نظریاتی طور پر ایک معقول فلسفہ ہے، لیکن جب اس فلسفے پر حد سے زیادہ عمل کیا گیا تو اس فلسفے نے آگے چل کر خود اپنی جڑ کاٹ لی۔ یہ بات درست ہے کہ جب لوگوں کو منافع کمانے کے لیے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد وطلب کی قوتیں برسرکار آئیں گی اور وہ ان مسائل کو حل کردیں گی، لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجیے کہ رسد وطلب کی قوتیں اس وقت تک کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں مسابقت کی فضا ہو اور آزاد مقابلہ ہو اور اجارہ داری نہ ہو۔

مثلاً میں بازار سے ایک چھتری خریدنا چاہتا ہوں اور بازار میں بہت سے لوگ چھتری بیچنے والے موجود ہیں جو مختلف قیمتوں پر چھتری بیچ رہے ہیں، ایک دوکاندار ۵۰۰ روپے میں بیچ رہا ہے اور دوسرا دوکاندار ۴۵۰ روپے میں بیچ رہا ہے، اب مجھے اختیار ہے کہ چاہے وہ چھتری ۵۰۰ روپے کی خریدوں یا ۴۵۰ روپے کی خریدوں، اس صورت میں تو رسد وطلب کی قوتیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں اور ان کا صحیح عمل ظاہر ہوتا ہے، لیکن اگر بازار میں چھتری بیچنے والا صرف ایک دکاندار ہے اور میرے پاس کوئی چوائس اور انتخاب نہیں ہے، اگر مجھے چھتری خریدنی ہے تو اسی سے خریدنی ہوگی، تو اب وہ اپنی من مانی قیمت میں چھتری بیچے گا اور اس کے اندر مجھے کوئی اختیار نہیں ہوگا اور اب رسد وطلب کی قوتیں یہاں ختم ہوگئیں، اس لیے اب تو صرف یک طرفہ قیمت کا تعین ہے، جو اس اجارہ دار نے مقرر کردیا اور مجھے کوئی اختیار نہیں رہا۔ لہٰذا یہ رسد وطلب کی قوتیں وہاں کام کرتی ہیں جہاں آزاد مقابلہ ہو اور اگر اجارہ داری ہو تو وہاں یہ

قوتیں کام نہیں دیتیں۔

پھر جب انسان کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا کہ جو طریقہ تم اختیار کرنا چاہو اختیار کر لو، تو اس نے ایسے ایسے طریقے اختیار کیے جس کے ذریعے بازار میں اجارہ داری قائم ہوگئی اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام میں انسان کو سود کے ذریعے منافع کمانا بھی جائز، قمار کے ذریعے منافع کمانا بھی جائز، سٹے کے ذریعے نفع کمانا بھی جائز اور ان تمام طریقوں سے نفع کمانا جائز ہے جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، جو طریقہ چاہے اختیار کرے انسان کو اس کی کھلی اجازت ہے اور اس کی کھلی چھوٹ کی وجہ سے بسا اوقات اجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں رسد و طلب کی قوتیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں، جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ عملی طور پر وجود میں نہیں آتا۔

منافع کمانے میں بالکل آزادی دینے کے نتیجے میں دوسری خرابی یہ پیدا ہوائی کہ کوئی اخلاقی قدر ایسی باقی نہیں رہی جو اس بات کا خیال کرے کہ معاشرے کو کون سی چیز مفید ہوگی اور کون سی چیز مضر ہوگی۔ ابھی چند روز پہلے امریکی رسالے ٹائم میں میں نے پڑھا کہ ایک ماڈل گرل مصنوعات کے اشتہار پر اپنی تصویر دینے کے لیے ایک دن میں ۲۵ ملین ڈالر وصول کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ تاجر اور کارخانہ دار یہ ۲۵ ملین ڈالر کہاں سے حاصل کرے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ غریب عوام سے وصول کرے گا، اس لیے کہ وہ چیز اور وہ پیداوار بازار میں آئے گی تو ۲۵ ملین ڈالر اس کی لاگت اور کاسٹ میں شامل ہو کر میری اور آپ کی جیب سے وصول ہوں گے۔

یہ فائیو اسٹار ہوٹل جن میں ایک دن کا کرایہ ۲۵۰۰ روپے یا ۳۰۰۰ روپے ہے ایک متوسط درجے کا آدمی ان ہوٹلوں کی طرف رخ کرتے ہوئے ڈرتا ہے، لیکن وہ تمام فائیو اسٹار ہوٹل ان غریب عوام کی آمدنیوں سے وجود میں آئے، کہ آپ یہ دیکھیں کہ ان ہوٹلوں میں کون جا کر ٹھہرتا ہے؟ یا تو سرکاری ملازمین اور سرکاری افسران گورنمنٹ کے اخراجات پر ٹھہرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان کا خرچہ گورنمنٹ ادا کرتی ہے اور گورنمنٹ کا مطلب ہے ٹیکس ادا کرنے والوں کا روپیہ اور یا پھر دوسرا طبقہ ان ہوٹلوں میں آکر ٹھہرتا ہے وہ تاجر، صنعت کار ہوتے ہیں، جو اپنے تجارتی سفروں کے درمیان ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں، لیکن وہ ان ہوٹلوں کا خرچہ کہاں سے وصول کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ سرمایہ دار اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتے، بلکہ درحقیقت وہ اخراجات اس چیز کی لاگت (Cost) میں شامل ہوں گے جو چیز وہ بازار میں فروخت کر رہا ہے اور اس کی لاگت میں شامل ہوکر اس کی قیمت میں اضافہ کریں گے اور پھر وہ قیمت عوام سے وصول کی جائے گی۔

لہٰذا کوئی اخلاقی قدر اور کوئی اخلاقی پیمانہ اس بات کا موجود نہیں ہے کہ منافع کمانے کا کون سا طریقہ درست اور معاشرے کے لیے مفید ہے اور کون سا طریقہ معاشرے کے لیے مضر اور مہلک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بداخلاقیاں، ناانصافیاں اور مظالم وجود میں آرہے ہیں۔

اسلام کے معاشی احکام

اب میں اسلام کی معاشی تعلیمات کی طرف آتا ہوں تاکہ مندرجہ بالا پس منظر میں اس کو اچھی طرح سمجھا جاسکے، اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ فلسفہ کہ

معاشی مسائل کا تصفیہ پلاننگ کے بجائے مارکیٹ کی قوتوں کے تحت ہونا چاہیے، اس بنیادی فلسفہ کو اسلام تسلیم کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ (۱)

یعنی ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کی تقسیم کردی ہے اور ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت عطا کی ہے اور اس کے بعد کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ ''لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا'' تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معیشت کی تقسیم کی ہے یعنی وسائل کی تقسیم، قیمتوں کا تعین اور تقسیمِ دولت کے اصول یہ سارے کے سارے کسی انسانی پلاننگ کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بازار اور اسی دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ معیشت خود بخود تقسیم ہوجائے۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے تقسیم کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود آکر دولت تقسیم فرمادی کہ اتنا تم لے لو اور اتنا تم لے لو، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قوانین بنا دیے ہیں جن کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہوجائے۔

اور ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلیٰ درجے کا معاشی اصول یہ بیان فرمایا کہ

(۱) سورۃ الزخرف آیت (۳۲)۔

"دعوا الناس یرزق اللّٰہ بعضھم من بعض"(۱)

لوگوں کو آزاد چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمادیتے ہیں۔

یعنی ان پر بلاوجہ پابندیاں نہ لگاؤ، بلکہ آزاد چھوڑو، اللہ تعالیٰ نے بڑا عجیب وغریب نظام بنایا ہے۔ مثلاً میرے دل میں اس وقت یہ خیال آیا کہ بازار میں جا کر لیچی خریدوں اور بازار میں جو شخص پھل بیچنے والا ہے اس کے دل میں یہ ڈال دیا کہ تم جا کر لیچی فروخت کرو اور اب جب میں بازار گیا تو دیکھا کہ ایک شخص لیچی بیچ رہا ہے، اس کے پاس گیا اور اس سے بھاؤ تاؤ کر کے اس سے لیچی لے لی اور اس کو پیسے دے دیے تو یہ مطلب اس حدیث کا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دو، اللہ تبارک وتعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمادیتے ہیں۔

بہر حال! یہ بنیادی اصول کہ مارکیٹ کی قوتیں ان بنیادی مسائل کا تعین کرتی ہیں یہ اصول تو اسلام کو تسلیم ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا یہ بنیادی امتیاز کہ معیشت کو مارکیٹ کی قوتوں پر بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اس کو اسلام تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسانوں کو منافع کمانے کے لیے اتنا آزاد نہ چھوڑو کہ ایک کی آزادی دوسرے کی آزادی سلب کر لے، یعنی ایک کو اتنا آزاد چھوڑا کہ وہ اجارہ دار بن گیا اور بازار میں اس کی اجارہ داری قائم ہوگئی اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی، لہٰذا اسلام نے اس آزادی پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں، وہ پابندیاں کیا ہیں؟ ان کو میں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ نمبر ایک "شرعی اور الٰہی پابندی"، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی عائد کردی

---

(۱) صحیح مسلم ۳/۱۱۵۷ (۱۵۲۲)۔

کہ تم اپنا منافع کماؤ، لیکن تمہیں فلاں کام نہیں کرنا، اس کو دینی پابندی بھی کہتے ہیں، دوسری قسم ہے ''اخلاقی پابندی''، تیسری قسم ''قانونی پابندی'' ہے، یہ تین قسم کی پابندیاں ہیں جو انسان پر شریعت نے عائد کی ہیں۔

۱۔ دینی پابندی

پہلی قسم کی پابندی جو ''دینی پابندی'' ہے یہ بہت اہمیت کی حامل پابندی ہے، جو اسلام کو دوسرے معاشی نظریات سے ممتاز کرتی ہے، اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام اب اپنے بنیادی اصولوں کو چھوڑ کر اتنا نیچے آگیا ہے کہ اب اس میں حکومت کی کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی ہے، لیکن حکومت کی یہ مداخلت ذاتی عقل اور سیکولر تصورات کی بنیاد پر ہوتی ہے اور اسلام جو پابندیاں عائد کرتا ہے وہ ''دینی پابندی'' ہوتی ہے۔ وہ دینی پابندیاں کیا ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ تم بازار میں منافع کماؤ، لیکن تمہارے لیے سود کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں، اگر ایسا کروگے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے، اسی طرح ''قمار'' کو ممنوع قرار دے دیا، قمار کے ذریعے آمدنی حاصل کرنا جائز نہیں اور ''احتکار'' ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دے دیا اور ''سٹہ'' کو ممنوع قرار دے دیا، ویسے تو شریعت نے یہ کہہ دیا ہے کہ جب دو آدمی اگر کوئی معاملہ کرنے پر راضی ہوجائیں تو پھر وہ معاملہ قانونی ہوجاتا ہے، لیکن وہ دونوں کسی ایسے معاملے پر راضی ہوجائیں جو معاشرے کی تباہی کا سبب ہو اس معاملے کی اجازت نہیں، مثلاً سود کے معاملے پر دو آدمی رضامندی سے معاملہ کرلیں تو چونکہ سود کے ذریعے معاشی طور پر نقصانات پیدا ہوتے ہیں تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں اس لیے شرعاً اس کی اجازت نہیں، اب سود کے ذریعے معاشی طور پر کیا تباہ

کاریاں ہوتی ہیں؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں، لیکن میں آپ کے سامنے ایک سادہ سی مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان تباہ کاریوں کا ذرا سا اشارہ ہوجائے گا۔

سودی نظام کی خرابی

سود کے نظریے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک شخص کی آمدنی یقینی اور دوسرے کی خطرے میں ہے اور غیر یقینی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی سے سود پر قرض لیا تو اب اس نے جس سے قرض لیا اس کو تو ایک متعین رقم بطور سود کے ضرور ادا کرنی ہے اور جس نے قرض لیا ہے وہ اس قرض کی رقم سے جب کاروبار کرے گا تو ہوسکتا ہے کہ اس کے کاروبار میں نفع ہو اور ہوسکتا ہے کہ اس کو کاروبار میں نقصان ہوجائے۔ دونوں باتیں ہوسکتی ہیں اور اب جس صورت میں قرض لینے والا نقصان میں رہا اس صورت میں ۱۶ فی صد قرض دینے والے بینک یا ادارے کو ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری اور لازم ہے۔ لہٰذا قرض لینے والا نقصان میں رہا اور بعض مرتبہ اس کے برعکس قرض دینے والا نقصان میں ہوتا ہے اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے بینک سے سود پر دس کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس سے کاروبار شروع کیا، بہت سی تجارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں سو فی صد نفع بھی ہوتا ہے۔ فرض کریں کہ اس شخص کو دس کروڑ پر پچاس فی صد نفع ہوا اب وہ بینک کو صرف سود کی متعین شرح ۱۵ فی صد اس نفع میں سے بینک کو ادا کرے گا اور باقی پورا ۳۵ فی صد خود اس کی جیب میں چلا گیا۔ اب یہ دیکھیے کہ جو اس نے تجارت کی

وہ پیسہ کس کا تھا؟ وہ تو عوام کا تھا اور اس کے ذریعے جو نفع کمایا گیا اس کا ۳۵ فی صد صرف ایک شخص کی جیب میں چلا گیا جس نے تجارت کی اور صرف ۱۵ فی صد بینک کے پاس پہنچا اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ تھوڑا سا حصہ مثلاً دس فی صد تمام ڈیپازیٹر کے درمیان تقسیم کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے پیسے سے جو ۵۰ فی صد نفع ہوا تھا اس کا صرف ۱۰ فی صد عوام میں تقسیم ہوا اور ۳۵ فی صد صرف ایک آدمی کی جیب میں چلا گیا اور عوام وہ دس فی صد لے کر بہت خوش ہے کہ ہم نے بینک میں سو روپے رکھوائے تھے اور اب سال بھر کے بعد ایک سو دس ہوگئے، لیکن اس بچارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دس روپے پھر واپس اس سرمایہ دار تاجر کے پاس چلے جاتے ہیں، اس لیے کہ اس تاجر نے ۱۵ فی صد بینک کو جو سود کی شکل میں دیا تھا وہ اس کو اپنی پروڈکشن کی لاگت میں شامل کرے گا اور لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت کا حصہ بن جائے گا اور وہ قیمت پھر عوام سے وصول کرے گا، لہٰذا ہر اعتبار سے وہ فائدے میں رہا پھر اس کو نقصان کا بھی خطرہ نہیں اور اگر بالفرض اس کو نقصان ہو بھی جائے تو اس کی تلافی کے لیے انشورنس کمپنیاں موجود ہیں وہ انشورنس کمپنیاں جس میں ان عوام کے پیسے رکھے ہیں جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لاسکتے جب تک وہ انشورنس کی قسط (Premium) ادا نہ کرے ان عوام کے پیسوں سے اس سرمایہ دار کے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے۔

بہرحال سودی نظام کے ظالمانہ طریقے کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کر دیا، لہٰذا سود کے ذریعے معیشت میں ناانصافی، ناہمواری پیدا ہونا لازم ہے، اس لیے شریعت نے اس کو منع کیا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے فوائد

اب اگر یہی تجارت سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں بینک اور سرمایہ لینے والے کے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوگا کہ یہ بینک کو ۱۵ فی صد ادا کرے گا، بلکہ یہ معاہدہ ہوگا کہ یہ سرمایہ لینے والا جو کچھ نفع کمائے گا اس کا آدھا مثلاً بینک کو ادا کرے گا اور آدھا تجارت کرنے والے کا ہوگا اب اگر پچاس فی صد نفع ہوا ہے تو پچیس فی صد بینک کو ملے گا اور پچیس فی صد اس کو ملے گا اس طرح دولت کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف ہوگا اس لیے کہ بینک کے واسطے سے وہ پچیس فی صد ڈیپازیٹر کو ملے گا، اس سے معلوم ہوا کہ سود کا برا اثر تقسیمِ دولت پر بھی پڑتا ہے اور اس کے نتائج معیشت کی پشت پر نظر آتے ہیں۔

قمار حرام ہے

اسی طرح اسلام نے قمار کو حرام قرار دیا ہے۔ قمار کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص نے تو اپنا پیسہ لگا دیا م اب دو صورتیں ہوں گی یا تو جو پیسہ اس نے لگایا وہ بھی ڈوب گیا یا اپنے ساتھ بہت بڑی دولت لے آیا، اس کو ''قمار'' کہتے ہیں۔ اس کی بے شمار شکلیں ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس مغربی نظامِ زندگی میں ''جوا'' (Gambling) کو بہت سی جگہوں پر قانون کے اندر ممنوع قرار دیا گیا ہے، لیکن جب (Gambling) مہذب شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ جائز ہو جاتی ہے اور خلافِ قانون نہیں رہتی، مثلاً ایک غریب آدمی سڑک کے کنارے جوا کھیل رہا ہے تو پولیس اس کو پکڑ کر لے جائے گی، لیکن اگر جوا کو مہذب شکل دے دی جائے اور اس کے لیے کوئی ادارہ قائم کر لیا جائے اور اس کا کوئی دوسرا

نام رکھ لیا جائے تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کا قمار ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے میں پھیلا ہوا ہے جس کے نتیجے میں بے شمار انسانوں سے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک انسان پر اس کی بارش کردی جاتی ہے اس لیے یہ جوا شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ''احتکار'' (Hoarding) یعنی ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے چوں کہ ہر انسان اس کو جانتا ہے اس لیے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

اکتناز جائز نہیں

اسی طرح ''اکتناز'' یعنی انسان اپنا پیسہ اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھے کہ اس پر جو شرعی فرائض ہیں ان کو ادا نہ کرے، مثلاً زکوۃ اور دیگر مالی حقوق ادا نہیں کرتا اس کو شریعت میں اکتناز کہتے ہیں اور شرعاً یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

ایک اور مثال

اور سنیے، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

''لا یبیع حاضر لباد''(۱)

(۱) صحیح مسلم ۱۱۵۷/۳ (۱۵۲۲)۔

کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔

یعنی دیہاتی اپنا مال دیہات سے شہر میں بیچنے کے لیے لا رہا ہے اس وقت میں کسی شہری کے لیے جائز نہیں کہ وہ جا کر اس سے کہے کہ میں تمہارا مال فروخت کردوں گا، بظاہر تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، اس لیے کہ اس معاملے میں شہری بھی راضی اور دیہاتی بھی راضی، لیکن سرکارِ دوعالم ﷺ نے اس سے منع فرمادیا اس لیے کہ شہری جب دیہاتی کا مال اپنے قبضہ میں کر لے گا تو وہ اس مال کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک کہ بازار میں اس کی قیمت زیادہ نہ ہوجائے، اس لیے عام گرانی پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ اس کے برخلاف اگر دیہاتی خود اپنا مال شہر میں لاکر فروخت کرے تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اپنا مال نقصان پر تو فروخت نہیں کرے گا، لیکن اس کی خواہش یہ ہوگی کہ جلدی سے اپنا مال فروخت کرکے واپس اپنے گھر چلا جاؤں، تو اس طرح حقیقی طلب اور حقیقی رسد کے ذریعے قیمتوں کا تعین ہوجائے گا اور اگر درمیان میں (Middleman) آگیا تو اس کی وجہ سے رسد اور طلب کی قوتوں کا آزادانہ کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور اس (Middleman) کی وجہ سے قیمت بڑھ جائے گی۔

اس لیے وہ تمام ذرائع اور تمام راستے جن کے ذریعے معاشرے کو گرانی کا شکار ہونا پڑے اور جن کے ذریعے معاشرے کو ناانصافی کا شکار ہونا پڑے ان پر شرعی اعتبار سے پابندی عائد کی گئی ہے، بہرحال یہ پابندیوں کی پہلی قسم ہے جو اس آزاد معیشت پر شرعاً عائد کی گئی ہیں۔

۲۔ اخلاقی پابندیاں

آزاد معیشت پر شرعاً دوسری پابندی جو عائد کی گئی ہے اس کو "اخلاقی پابندی" کہتے ہیں، اس لیے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو شرعاً حرام تو نہیں اور نہ ان کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، البتہ ان کی ترغیب ضرور دی جاتی ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام ایک معاشی نظام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دین اور ایک نظامِ زندگی ہے جس میں سب سے پہلے یہ بات سکھائی گئی ہے کہ اگر تم فلاں کام کرو گے تو آخرت میں تمہیں بہت بڑا اجر ملے گا، اسلام ذاتی منافع کا محرک تو ہے، لیکن وہ صرف دنیاوی منافع کی حد تک محدود نہیں، بلکہ ذاتی منافع میں آخرت کے منافع کو بھی لازماً شامل سمجھتا ہے، لہٰذا اسلام نے بہت سے احکام ہمیں اس بات کے دیے ہیں کہ تمہیں دنیا میں اگرچہ نفع کچھ کم ملے، لیکن آخرت میں اس کا نفع بہت ملے گا مثلاً شرعاً یہ کہا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اپنی معیشت کو کمانے کے لیے بازار میں نکلا ہے اگر وہ یہ نیت کرے کہ وہ اس لیے بازار نکلا ہے کہ معاشرے کی فلاں ضرورت پوری کروں گا تو اس کی نیت کی وجہ سے اس کا یہ سارا عمل عبادت بن جائے گا اور باعثِ اجر ہو جائے گا اور پھر اس نقطۂ نظر سے انسان اس چیز کا انتخاب کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہوگی اور حقیقت میں معاشرے کو دینی اعتبار سے ضرورت ہونی چاہیے، مثلاً فرض کریں کہ لوگ اگر رقص وسرور کے زیادہ شائق ہیں تو اس صورت میں کیپٹل ازم کا تصور تو یہ ہے کہ لوگ زیادہ منافع کمانے کے لیے ناچ گھر قائم کریں چونکہ اس کی طلب زیادہ ہے، لیکن اسلام کی اس دینی پابندی کے تحت اس کے لیے ناچ گھر قائم کرنا جائز نہیں یا مثلاً ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ میں فلاں کارخانہ لگاؤں گا تو اس میں مجھے منافع تو بہت ہوگا، لیکن اس وقت چونکہ رہائشی

ضرورت کے لیے لوگوں کو مکانات کی ضرورت ہے اور اس میں منافع زیادہ تو نہیں ہوگا، لیکن لوگوں کی ضرورت پوری ہوگی تو اس وقت شریعت کی اس اخلاقی پابندی پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت کے منافع کا حق دار ہوگا۔

۳۔قانونی پابندی

تیسری پابندی ''قانونی پابندی'' ہے یعنی اسلام نے اسلامی حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ جس مرحلے پر حکومت یہ محسوس کرے کہ معاشرے کو کسی خاص سمت پر ڈالنے کے لیے کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہے تو ایسے وقت میں حکومت کوئی حکم جاری کرسکتی ہے اور پھر وہ حکم تمام انسانوں کے لیے قابلِ احترام ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (۱)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی بھی اطاعت کرو اور اولی الامر یعنی اہلِ ریاست کی بھی اطاعت کرو اسی لیے فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اگر حاکم وقت جو صحیح معنیٰ میں اسلامی حکومت کا سربراہ ہو اگر کسی مصلحت کی بنیاد پر یہ حکم دے دے کہ فلاں دن تمام لوگ روزہ رکھیں تو اس دن روزہ رکھنا پوری رعایا پر عملاً واجب ہوجائے گا اور اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھے گا تو عملی طور اس کو ایسا ہی گناہ ہوگا جیسے رمضان کا روزہ چھوڑنے کا گناہ ہوتا ہے اس لیے

(۱) سورۃ النساء آیت (۵۹)۔

کہ اولی الامر کی اطاعت فرض ہے۔[1]

اسی طرح فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ اگر اولی الامر یہ حکم جاری کردے کہ لوگوں کے لیے خربوزہ کھانا منع ہے تو اب رعایا کے لیے خربوزہ کھانا حرام ہوجائے گا بہرحال اولی الامر کو ان چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے وہ یہ احکام عام لوگوں کی مصلحت کے تحت جاری کرے اس میں جزوی منصوبہ بندی بھی داخل ہے مثلاً حکومت یہ کہہ دے کہ فلاں چیز میں لوگ سرمایہ کاری کریں اور فلاں چیز میں سرمایہ کاری نہ کریں تو حکومت حدودِ شرعیہ میں قانونی طور پر اس قسم کی پابندی عائد کرسکتی ہے۔

بہرحال کیپٹل ازم کے مقابلے میں اسلام کے معاشی نظام میں یہ بنیادی امتیاز اور فرق ہے اور یاد رکھیے کہ جہاں تک قانونی پابندی کا تعلق ہے یہ پابندی کیپٹل ازم میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ پابندیاں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں اور اسلام میں اصل امتیاز دینی پابندیوں کا ہے جو ''وحی'' کے ذریعے مستفاد ہوتی ہیں اور جس میں اللہ تعالیٰ، جو پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے، وہ یہ ہدایت کرتا ہے کہ فلاں چیز تمہارے لیے مضر ہے اور منع ہے، درحقیقت یہ ایسی چیز ہے کہ جب تک انسانیت اس راستے پر نہیں آئے گی اس وقت تک انسانیت افراط وتفریط کا شکار رہے گی۔

بے شک اشتراکیت میدان میں شکست کھا گئی، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی جو خرابیاں تھیں یا اس کی جو ناانصافیاں اور ناہمواریاں تھیں کیا وہ ختم ہوگئیں؟ وہ یقیناً آج بھی اسی طرح برقرار ہیں اور ان کا حل اگر ہے تو وہ ان الٰہی پابندیوں

(۱) ملاحظہ ہو الدر المختار مع رد المحتار ۶/۴۶۰ طبع دار الفکر بیروت۔

میں ہے اور ان الٰہی پابندیوں کی طرف آئے بغیر انسان کو سکون حاصل نہیں ہوسکتا، بس ہماری شامتِ اعمال یہ ہے کہ ابھی تک ان ''الٰہی پابندیوں'' پر مبنی معیشت کا کوئی عملی ڈھانچہ اور عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش نہیں کرسکے اور ہمارے ملک پاکستان کے سامنے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ ان معاشی تعلیمات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرکے دکھائے تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ حقیقت میں اسلامی معیشت کن بنیادی خصوصیات کی حامل ہے اور کس طرح ان کو اپنایا جاسکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے استحقاق سے زیادہ آپ حضرات کا وقت لے لیا اور اس بات کا بھی احساس ہے کہ ایک خشک موضوع کے اندر میں نے آپ کو مشغول رکھا اور میں آپ حضرات کے حسنِ سماعت کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے صبر وضبط اور تحمل کے ساتھ اس گفتگو کو سنا، اللہ تعالیٰ اس کو میرے لیے بھی اور سننے والوں کے لیے مفید بنائے اور اس کی بہتر نتائج پیدا کرے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين
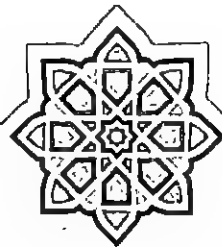
اسلام، جمہوریت اور سوشلزم

(ہمارا معاشی نظام ص ۸۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام، جمہوریت اور سوشلزم

''اسلام ہمارا مذہب ہے
جمہوریت ہماری سیاست ہے
اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔''

یہ وہ نعرہ ہے جسے پچھلے دنوں ہمارے ملک کی بعض سیاسی جماعتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ پھیلایا، اس نعرہ کی پہلی سطر میں ''اسلام'' کا لفظ بظاہر یہ تأثر دیتا ہے کہ اس میں ''اسلام'' کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی ہے، لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ اس نعرے میں ''اسلام'' کی مثال بالکل اسی شخص کی سی ہے جس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے تختِ سلطنت پر بٹھا دیا گیا ہو۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تین جملوں کو پڑھ کر ''اسلام'' کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ معاذ اللہ اسلام بھی عیسائیت، یہودیت یا ہندومت کی طرح پوجا پاٹ کی چند رسموں یا اخلاق کے چند مجمل اصولوں کا نام

ہے اور زندگی کے دوسرے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگر کوئی شخص عبادت کے چند خاص طریقوں کو اپنا لے تو اس کے بعد وہ اپنی حکومت اور اپنی معیشت کو جس نظام کے ساتھ بھی وابستہ کرنا چاہے کرسکتا ہے، وہ مسجد میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیمات کا پابند ہے، لیکن اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد یا اپنے لیے رزق کی تلاش کے وقت اسلام نے یا تو اسے رہنمائی دی ہی نہیں ہے یا اگر دی ہے تو وہ ۔معاذ اللہ۔ اتنی ناقص اور بے کار ہے کہ اس کے ذریعے اس کے سیاسی اور معاشی مسائل حل نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اپنی سیاست میں جمہوریت سے اور اپنی معیشت میں سوشلزم سے ''روشنی'' حاصل کرے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کا مفہوم یہی کچھ ہے تو پھر یہ دعویٰ آپ فضول کرتے ہیں کہ

''اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور اس میں انسان کی تمام موجودہ پریشانیوں کا حل موجود ہے۔''

پھر تو کھل کر آپ کو کہنا چاہیے کہ اسلام نے عبادات وعقائد کے علاوہ زندگی کے کسی مسئلہ میں ہمیں کوئی ہدایت نہیں دی اور ۔معاذ اللہ۔ ہم اپنے سینوں میں قرآن رکھتے ہوئے بھی کارل مارکس اور ماؤزے تنگ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔

اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات صرف عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل نظام ہے تو پھر مسجد ہو یا بازار، حکومت کا ایوان ہو یا تفریح کا میدان، آپ کو ہر مقام پر صرف اور صرف اسلام

ہی کی پیروی کرنی پڑے گی، پھر اس طرزِ عمل کا کوئی مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں پہنچ کر تو آپ بیت اللہ کی طرف رخ کریں اور دفتر و بازار میں پہنچ کر ماسکو اور بیجنگ کو اپنا قبلہ وکعبہ بنالیں، آپ کو ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر انسانیت کے صرف اس محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے چشم و ابرو کو دیکھنا ہوگا جس کی تعلیمات نے صرف مسجدوں میں اجالا نہیں کیا، بلکہ اس کے نورِ ہدایت سے حکومت کے ایوان اور معیشت کے بازار بھی یکساں طور پر جگمگائے ہیں۔

بعض حضرات اس نعرے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں جس سوشلزم کو اپنایا گیا ہے وہ لادین سوشلزم نہیں، بلکہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے اور جس طرح ''جمہوریت'' اسلامی ہوسکتی ہے اسی طرح ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح بھی درست ہے۔

اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جہاں اصطلاح کا تعلق ہے ہمارے نزدیک نہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح درست ہے اور نہ ''اسلامی سوشلزم'' کی، یہ دونوں نظام مغرب کی لادینی فکر کی پیداوار ہیں اور ان کے ساتھ اسلام کا پیوند لگانا ایک طرف اسلام کی توہین ہے اور دوسری طرف اس سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں نظام جوں کے توں اسلام کے مطابق ہیں، لہٰذا لفظوں کی حد تک تو یہ دونوں اصطلاحیں ہماری نظر میں غلط اور مغالطہ انگیز ہیں اور مسلمانوں کو دونوں ہی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

لیکن معنویت کے لحاظ سے ''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، جمہوریت کے فلسفے میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں، (مثلاً عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور، لیجس لیچر کا خدائی

احکام کی پابندی کے بغیر خود واضع قانون ہونا اور امیدوار حکومت کا از خود اقتدار طلب کرنا) لیکن جمہوریت کی وہ بہت سی باتیں اسلام کے مطابق بھی ہیں جنہیں عرفِ عام میں جمہوریت کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، یعنی شورائی حکومت، تقسیمِ اختیارات، آزادیٔ اظہارِ رائے اور عوام کے سامنے حکومت کی جواب دہی وغیرہ۔ اب جو لوگ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد نظامِ جمہوریت کی صرف وہ باتیں ہیں جو اسلام کے خلاف نہیں ہیں، ان کو نکال کر جو باقی بچتا ہے وہ ''اسلامی جمہوریت'' ہے، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان لاکر جمہوری نظامِ حکومت کو جوں کا توں قبول کرلیا جائے تو وہی لادینی جمہوریت اسلامی بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے نزدیک لادینی جمہوریت کی خرابی صرف اس قدر نہیں ہے کہ اس کا نظریہ پیش کرنے والے مادہ پرست اور غیر مسلم تھے جنہوں نے اپنی مادہ پرستی کا جوڑ جمہوریت سے ملا دیا تھا اور اگر توحید پر ایمان رکھنے والے لوگ اسے بعینہٖ اختیار کرلیں گے تو اس کی خرابی دور ہوجائے گی، بلکہ ان کے نزدیک کچھ خرابیاں خود جمہوریت میں پائی جاتی ہیں اور ان خرابیوں کو نکال کر باقی ماندہ حصے کو وہ ''اسلامی جمہوریت'' قرار دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ بلند کرنے والوں کا کہنا یہ ہے کہ سوشلزم کے معاشی نظام میں بذاتہ کوئی خرابی نہیں، اس کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس کے پیش کرنے والے منکرِ خدا تھے اور انہوں نے اس انکارِ خدا کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملادیا تھا، اب اگر اسی معاشی نظام کو مسلمان اختیار کرلیں تو اس کی خرابی دور ہوجاتی ہے، گویا سوشلزم کے معاشی نظام کو جوں کا توں لے کر اس میں خدا، رسول

اور آخرت کے عقائد کو شامل کر لیجیے تو وہی لادینی سوشلزم اسلامی بن جاتا ہے۔

اور اگر یہ حضرات یہ کہتے بھی ہیں کہ ہم نے سوشلزم سے غیر اسلامی اجزا کو نکال کر اس کا نام ''اسلامی سوشلزم'' رکھا ہے تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے، ورنہ ان کا یہ دعویٰ دو وجہ سے غلط ہے، ایک تو اس لیے کہ انہوں نے اپنے تجویز کردہ معاشی نظام میں سوشلزم کے معاشی نظام کی تمام وہ باتیں باقی رکھی ہیں جو صریحی طور پر خلافِ اسلام ہیں۔ سوشلزم کی بنیاد وسائلِ پیداوار پر جبری قبضہ کر لینے پر ہے اور یہ بات جوں کی توں ان کے ''اسلامی سوشلزم'' میں بھی موجود ہے جس کی صراحت ان کے رہنما اپنی تحریر وتقریر میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں، دوسرے اس لیے کہ سوشلزم کا صرف مادی فلسفہ نہیں، بلکہ اس کا معاشی نظام بھی سر سے لے کر پاؤں تک اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا اگر اس میں سے غیر اسلامی اشیاء کو نکال دیا جائے تو حاصلِ تفریق کچھ بچتا ہی نہیں ہے جسے ''اسلامی سوشلزم'' کہا جاسکے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ''اسلامی جمہوریت'' کی اصطلاح بالکل ایسی ہی ہے جیسے ''اسلامی بینکاری'' کی اصطلاح، موجودہ بینکاری کا سارا نظام سود پر چل رہا ہے، اس لیے یہ نظام بلاشبہ غیر اسلامی ہے، لیکن اگر اسی نظام سے سود کی گندگی کو خارج کر کے اسے مضاربت کے اصولوں پر چلایا جائے تو یہی نظام اسلام کے مطابق ہوجائے گا، اب اگر کوئی شخص ایسے نظام کا نام ''اسلامی بینکاری'' رکھ دے تو اس کی اصطلاح پر تو اعتراض کیا جاسکتا ہے، لیکن معنویت کے لحاظ سے اس کی بات غلط نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ''اسلامی سوشلزم'' کی مثال ایسی ہے جیسے ''اسلامی سود''

اور ''اسلامی قمار''۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ ''سود'' اور ''قمار'' کی خرابی صرف یہ تھی کہ اس کے موجدِ اسلام کے بنیادی عقائد کے قائل نہ تھے، اب ہم ان نظریات میں سے تمام غیراسلامی اشیاء کو نکال دیتے ہیں اور توحید، رسالت اور آخرت کو مان کر سود کھاتے اور قمار کھیلتے ہیں، لہٰذا ہمارے سود و قمار کا نام اسلامی سود و قمار ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ بات حد درجہ مضحکہ خیز ہوگی اس لیے کہ سود وقمار سرتا پا خلافِ اسلام چیزیں ہیں اور ان میں سے خلافِ اسلام اشیاء کو نکال دیا جائے تو کوئی ایسی چیز باقی ہی نہیں رہتی جس کا نام ''اسلامی سود'' یا ''اسلامی قمار'' رکھا جائے۔

لہٰذا اسلامی جمہوریت کی اصطلاح لفظی طور پر غلط سہی، لیکن معنی کے اعتبار سے ''اسلامی سوشلزم'' کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اس لیے اختیار کی ہے کہ ماضی میں بہت سے لوگوں نے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اصطلاح سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ نظام کا حامی نہیں، لیکن یہ دلیل بھی انتہائی بودی اور کمزور ہے کیونکہ ایک غلط فہمی کو رفع کر کے دوسری غلط فہمی پیدا کر دینا عقل و خرد کی کون سی منطق کا تقاضا ہوسکتا ہے؟ اگر واقعتاً مقصد یہی واضح کرنا ہے کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم وستم کا حامی نہیں تو پھر اس کے لیے اسلامی سوشلزم کے بجائے ''اسلامی عدلِ عمرانی'' (Islamic Social Justice) کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔

پھر اس نعرے میں اسلام اور جمہوریت کو سوشلزم کے ساتھ معصومیت سے شیر وشکر کر کے پیش کیا گیا ہے، گویا ان دونوں چیزوں کا سوشلزم کے ساتھ کوئی

تصادم نہیں ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اشتراکیت نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ نہ تو کسی مرحلے پر اسلام سے میل کھاتا ہے اور نہ کسی مقام پر جمہوریت اسے چھو کر گزری ہے۔ اسلام بلاشبہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی منصفانہ طریقے پر تقسیم ہو اور سرمایہ دارانہ نظام میں جو دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ وسیع دائروں میں گردش کرے، لیکن اس مقصد کے لیے جو ظالمانہ طریقۂ کار سوشلزم نے تجویز کیا ہے اسلام اس کا کسی طرح بھی روا دار نہیں، اس لیے کہ وسائلِ پیداوار کو لوگوں سے چھین کر حکومت کے چند افراد کے ہاتھوں میں تھما دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ ملک کی ساری دولت ایک بڑی سرمایہ دار جماعت کے حوالے ہوجائے اور عام آدمی اپنا پیٹ بھرنے کے لیے پہلے سے زیادہ اس کے رحم و کرم کا محتاج ہو کر رہ جائے، لہٰذا انفرادی ملکیت کی جس نفی پر سوشلزم کی بنیاد ہے، اسلام چند قدم بھی اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

اسی طرح سوشلزم کی تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت بھی کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکی، جمہوریت کی روح ''آزادیِ اظہارِ رائے'' پر قائم ہے اور سوشلزم نظامِ زندگی میں یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کا واقعات کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، سوشلزم جس جگہ بھی قائم ہوا ہے جبر و تشدد کے ذریعے قائم ہوا ہے، اس نے ہمیشہ فکر و رائے کا گلا گھونٹ کر اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی ہے، اس کے خود پسند مزاج نے اس آواز کو کبھی گوارہ نہیں کیا جو اس پر تنقید کرنے کے لیے اٹھی ہو اور اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں جو ''منصوبہ بند معیشت'' قائم کی جاتی ہے وہ شدید ترین آمریت کے بغیر نہ قائم ہوسکتی ہے اور نہ باقی رہ سکتی ہے۔ یقین نہ آئے تو ان ملکوں کے حالات پڑھ کر دیکھیے جہاں سوشلزم کے نظام

کو نافذ کیا گیا ہے، کیا وہاں اشتراکی پارٹی کے سوا کوئی اور سیاسی جماعت پنپ سکتی ہے؟ کیا وہاں مزدور کو حق ہے کہ وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کوئی چھوٹی سی انجمن ہی بنالے؟ کیا وہاں کا مزدور حکومت کے کسی فیصلے کے خلاف ہڑتال کرسکتا ہے؟ کیا وہاں کے پریس کو آزادی ہے کہ وہ برسرِ اقتدار جماعت کے خلاف چوں بھی کرسکے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو پھر آخر وہ کون سی جمہوریت ہے جس کا جوڑ سوشلزم کے ساتھ ملایا گیا ہے؟ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ہم جانتے ہیں کہ بہت سے وہ حضرات بھی اس نعرے کے ساتھ ہم آواز ہوگئے ہیں جو ذہنی اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی جنت ارضی بھی انہیں پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے، لیکن وہ سوشلزم کے فریب میں صرف اس لیے آگئے ہیں کہ اس ''جنتِ شداد'' پر ''اسلام'' کا سائن بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ ایسے حضرات سے ہم خاص طور پر دردمندانہ التجا کرتے ہیں کہ وہ مندرجہ بالا حقائق پر غور فرمائیں اور اسلامی سوشلزم کی تاریخ کا مطالعہ کرکے یہ دیکھیں کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں؟ اور اسلامی اقدار کو کس طرح ایک ایک کرکے پامال کیا ہے؟ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں بلاشبہ قابلِ نفریں ہیں اور ہر دھڑکتے ہوئے دل میں ان کو مٹانے کا جذبہ ہونا چاہیے، لیکن یاد رکھیے کہ غریب مزدور اور کسان کو امن وسکون صرف غریبوں کے اس چارہ ساز صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں مل سکے گا جس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا، اشتراکیت کی جھولی میں گرنے کے

بعد اس کی مثال اس پرندے سے مختلف نہیں ہوگی جو کھولتی ہوئی دیگ سے اچھل کر دہکتی ہوئی آگ میں جا گرے۔

وما علینا إلا البلاغ

اسلام اور جاگیردارانہ نظام

(انعام الباری ۷/ ٦٠)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام اور جاگیردارانہ نظام

عطاءِ جاگیری کی شرعی حیثیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کی زمینوں میں سے کچھ جاگیریں انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو دینے کا ارادہ فرمایا اور اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کو دینا مقصود تھا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس وقت بنونضیر جلا وطن ہوئے تھے اور ان کی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زمینیں صرف مہاجرین کو تقسیم فرمائی تھیں اور سوائے چند انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے اور کسی انصاری کو کوئی زمین عطا نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس تو پہلے سے ہی مدینہ منورہ میں کئی زمینیں تھیں اور مہاجرین چونکہ اپنے گھر بار سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونضیر کی زمینیں ان کو عطا فرمادی تھیں۔ جب بحرین فتح ہوا اور اس کی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ وہ زمینیں انصار کو عطا کی جائیں تاکہ بنونضیر کی زمینوں کی اس

طرح کچھ تلافی ہو جائے۔

تو انصارِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زمینیں ہمیں عطا نہ فرمائیں یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مہاجرین بھائیوں کو بھی ویسی ہی زمینیں عطا فرمائیں جیسی ہمیں عطا فرما رہے ہیں۔

انصارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا جذبہ ایثار

انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے دوبارہ ایثار سے کام لیا اور عرض کیا کہ ہمیں تو عطا فرمارہے ہیں اور مہاجرین کو نہیں دے رہے، لہٰذا مہاجرین کو بھی عطا فرمائیں اور ہمیں بھی، لیکن اس وقت اتنی زمینیں نہیں تھیں کہ انصار اور مہاجرین کو برابر دی جاسکتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے بھی ارشاد فرمایا کہ

سترون بعداثرة فاصبروا حتی تلقونی

یہ جملہ ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین سے واپسی پر وہاں کا مالِ غنیمت اس وقت زیادہ تر وہیں کے لوگوں کو دیا تھا اور بعض انصار کے دل میں خیال پیدا ہوا تو اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم میرے بعد کچھ ترجیح دیکھو گے کہ تمہارے اوپر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جارہی ہے، یعنی میرے بعد جو امراء آئیں گے، وہ بعض اوقات تمہارے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے، جس میں تمہارے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جائے گی تو فرمایا کہ "فاصبروا" اس ترجیحی سلوک کو برداشت کرنا، صبر کرنا "حتی تلقونی" یہاں تک کہ تم مجھ سے حوضِ کوثر پر آملو۔

یہ نہیں فرمایا کہ "ایک تحفظ حقوقِ انصار کی انجمن بنالینا" اور پھر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا اور جلوس نکالنا، بلکہ یہ فرمایا کہ "فاصبروا" صبر کرنا۔ کیونکہ اس صبر کرنے کا جو اجر وثواب اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائیں گے اور اس نقصان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو تمہیں دنیا میں حاصل ہوگا۔

عطاءِ جاگیر کا مسئلہ

یہاں جو بنیادی مسئلہ قابلِ ذکر ہے وہ عطاءِ جاگیر کا ہے کہ آیا حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی کو کوئی زمین بطورِ جاگیر دے دے؟

چند صدیوں سے پہلے یورپ میں اور پھر بعد میں ایشیائی ممالک میں بھی ایک خاص قسم کا معاشی اور سیاسی نظام جاری رہا ہے، جس کو جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں۔

اس جاگیری نظام میں طرح طرح کے معاشی اور سیاسی مفاسد لوگوں کے سامنے آئے، اس کی بنا پر جاگیردارانہ نظام بہت بدنام ہوا اور جاگیری نظام کے خلاف پوراعلمِ بغاوت بلند اور زمین کی ملکیت کا سرے سے ہی انکار کردیا۔

اس موقع پر اشتراکیت نے بھی جاگیردارانہ نظام کو اور زیادہ بدنام کردیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اُٹھا کہ اسلام میں عطاءِ جاگیر کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟

تو لوگوں نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں عطاءِ جاگیر کی کوئی گنجائش ہے تو یہ جاگیردارانہ نظام کی حمایت ہوگی اور اسلام کی طرف جاگیردارانہ نظام کی حمایت منسوب کرنا خود اسلام کو بدنام نہ کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا انہوں نے

دعویٰ کیا کہ اسلام میں جاگیردارانہ نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور عطاءِ جاگیر اسلام میں نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی یہ ذہنیت ہے کہ جب کوئی نظریہ ایک دم بہت زور وشور کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ اس نو پید نظریے کے بارے میں اسلام کی کیا تعلیمات ہیں، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں کہ نہیں جناب اسلام اس نظریے کا قائل نہیں ہے اور اس طرح اپنے ذہن اور خیال کے مطابق اسلام کی خدمت کرتے ہیں تاکہ اسلام کی بدنامی نہ ہو اور اس کے ماتھے پر جو داغ لگ رہا ہے وہ دور کردیا جائے، اس لیے یہ کہنا شروع کردیا کہ عطائے جاگیر اسلام میں ہے ہی نہیں، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے، ابھی آپ نے احادیث میں دیکھا کہ انصار کو جاگیر دینے کا ذکر ہے، اس طرح بے شمار جاگیریں مختلف زمانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا فرمائی گئیں۔

مثلاً حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا بیت المقدس کا علاقہ دے دیا تھا، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو یمن کا بہت بڑا علاقہ بطورِ جاگیر عطا فرمایا تھا، حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑی جاگیر عطا کی اور اسی طرح حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو بھی عطا کی تھی۔ تو عطاءِ جاگیر کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور خاص طور سے امام ابو عبید رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب الاموال'' امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب الخراج'' اور ابن آدم کی ''کتاب الخراج'' میں عطاءِ جاگیر کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ (۱)

(۱) راجع للتفصیل کتاب الخراج للقاضی أبی یوسف یعقوب بن ابراھیم ص: ٦٢-٧١

موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتداء

یورپ کے جاگیری نظام کی حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ لوگ صرف جاگیر کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور یہ نہیں سمجھا کہ وہ جاگیری نظام جو یورپ سے شروع ہوا تھا اور جس کے بے شمار مفاسد سامنے آئے اس میں اور اسلام کی عطائے جاگیر میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا سمجھے بغیر کہہ دیا کہ اسلام میں جاگیر کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔

لہٰذا پہلے یہ سمجھیے کہ یورپ کا جاگیر نظام کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ جس شخص کو جاگیر دی جاتی تھی، جاگیردار بنایا جاتا تھا اس کو زمین بطور ملکیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ عام طور پر جاگیردار سے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ یہ سارے علاقے کی زمینوں کے لگان، خراج لینے کا صرف آپ کو حق حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ کراچی کے آس پاس جتنے دیہات ہیں ان پر جتنی زمینیں ہیں، ان پر جو لوگ کاشت کاری کرتے ہیں، ان سے حکومت کے بجائے آپ خراج وصول کریں اور اس خراج کی تعیین بھی وہی کرتے تھے اور انہی کو یہ حق حاصل تھا کہ کون سی زمین سے کتنا خراج وصول کرنا ہے اور عام طور سے یہ جاگیریں اس کو دی جاتی تھیں جس نے حکومت کے لیے کوئی خاص خدمات انجام دی ہوں۔

اس وقت بادشاہت کا دور تھا، عموماً بادشاہ اپنے دوستوں اور بڑے بڑے فوجی افسروں کو یہ جاگیریں دیتے تھے، بادشاہ نے جس کو نواز دیا کہ اتنی جاگیر ہم نے تم کو دے دی ہے، لہٰذا یہاں کے علاقے کا خراج تم وصول کرو، لیکن اس

کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی جاتی تھی کہ جب کبھی حکومت کو جنگ وغیرہ کے موقع پر لڑنے والوں کی ضرورت پیش آئے گی تو دس ہزار آدمی یا پانچ ہزار آدمی تم لے کر آؤ گے، باقی جس طرح چاہو تم ان لوگوں سے خراج وصول کرو، جتنا چاہو وصول کرو اور جو تم وصول کرو گے وہ تمہاری ملکیت ہوگا۔
ہمارے ہاں یہ اصطلاحات مشہور تھیں کہ یہ دس ہزاری جاگیردار ہے، یہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے، اس کا مطلب یہ تھا کہ جو جنگ کے موقع پر دس ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ دس ہزاری جاگیردار ہے اور جو پانچ ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ خراج کی مقدار کے تعین کے حقوق بھی ان کو حاصل تھے تو بسا اوقات اپنے مفاد کی خاطر کاشت کاروں کے اوپر زیادہ خراج عائد کردیتے تھے اور چونکہ کاشت کار یہ سمجھتے تھے کہ خراج عائد کرنا ان لوگوں کا کام ہے اور اگر ہم نے ذرا سا بھی ان کے چشمِ ابرو کے خلاف کام کیا تو ہمارا خراج بڑھا دیں گے اور خراج بڑھنے کے نتیجے میں ہمارے لیے زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا اور زندگی دوبھر ہوجائے گی، لہٰذا وہ ان کے ہر حکم کی اطاعت کرتے تھے اور وہ ان کے اوپر طرح طرح کے بیگار عائد کرتے تھے یہ کرو وہ کرو، اگر وہ نہ کریں تو یہ خراج بڑھا دیتے تھے۔ درحقیقت ان کی حیثیت غلاموں جیسی ہوگئی تھی، اس واسطے ان کو اصطلاح میں ''رعیت'' کہا جاتا تھا، وہ بے چارے کاشت کار ان کا ہر حکم ماننے کے پابند ہوتے تھے اور یہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے تھے کام لیتے اور ان سے خراج وصول کرتے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ جب ان کے قبضے میں اتنی بڑی مخلوق آگئی جو ان کی ''رعیت'' ہے اور وہ غلاموں جیسی ہے تو گویا یہ ان کا لشکر ہے اور ان کا

بادشاہ سے وعدہ بھی ہوتا تھا کہ جنگ کے موقع پر ضرورت کے وقت بادشاہ کو دس ہزار آدمی فراہم کریں گے، تو اس طرح ایک آدمی دس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، کوئی بیس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، ان کی حیثیت اپنے علاقے میں بادشاہ جیسی ہوتی تھی، جب بادشاہ جیسی حیثیت قائم ہوگئی تو گویا اندرونِ ملک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ ان کی دفاعی اور سیاسی قوت بھی بہت زیادہ مضبوط ہوگئی، اس طرح یہ اپنے اپنے علاقوں میں بڑے مستحکم اور مضبوط ہوگئے اور سیاسی اعتبار سے ان کا ایک مرتبہ ہوگیا۔ اب یہ بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھانے لگے کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تم سے بغاوت کردیں گے، اتنا لشکر ہمارے پاس موجود ہے اور بغاوت کر کے ہم اپنی الگ سلطنت بنالیں گے۔

لہٰذا جاگیردار بادشاہ کے اوپر مسلط ہوگئے اور اگر آٹھ دس جاگیردار آپس میں مل جاتے تھے تو بادشاہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے اور ہر حکم ماننے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے بادشاہ سے منوالیتے تھے تو بادشاہ گویا ان کا تابع ہوگیا۔

لہٰذا ان جاگیرداروں نے ایک طرف تو اپنے زیرِ جاگیر لوگوں کو رعیت اور غلام بنایا ہوا تھا اور دوسری طرف بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھا رہے ہیں اور اس کے ساتھ من مانی کر رہے ہیں، اس سے اپنے مفادات اور مرضی کے خلاف فیصلے کرا رہے ہیں تو یہ ہے یورپ کا وہ جاگیرداری نظام جو ایک عرصے تک یورپ میں رہا۔ پھر اس کے اثرات ہمارے ہندوستان اور پاکستان میں بھی آئے اور اس کا باقی ماندہ اثر بلوچستان میں سرداری نظام کی صورت میں ہے کہ جو سردار ہوتا ہے

وہ ایک طرح سے -اللہ بچائے- اپنے زیرِ جاگیر لوگوں کے لیے فرعون بنا بیٹھا ہے کہ ان سے خراج وصول کرتا ہے۔ آج بھی بلوچستان میں کاشت کار اپنی پیداوار کا چھٹا حصہ جاگیردار کو بطور خراج دیتا ہے جسے وہ ''ششک'' کہتے ہیں۔

اور تمام لوگ جو جاگیردار کے تحت ہیں وہ اس کے غلام ہیں اور سرداروں نے یہ کام کر رکھا ہے کہ ہمارے زیرِ جاگیر لوگ کسی طرح تعلیم حاصل نہ کر پائیں، کیونکہ انہوں نے اگر تعلیم حاصل کر لی تو یہ ہمارے مطیع اور فرماں بردار نہیں رہیں گے، اس لیے ان کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہ بنے اور کوئی سڑک نہ بنے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں تعلیم وتمدّن آجائے اور یہ دونوں چیزیں آنے کی صورت میں یہ اپنے آپ کو غلام سمجھنا چھوڑ دیں گے، یہ سارے فسادات اس سے پھیلے۔

یہ وہ جاگیرداری نظام تھا جس کے خلاف مزاحمت کا رویہ پیدا ہوا اور بالآخر یورپ میں ختم ہوا اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ختم ہوا، اس کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی اور بعض جگہوں میں یہ ابھی تک باقی ہے اور نفرت بھی باقی ہے۔

اسلام میں عطاءِ جاگیر کا مطلب

اس کے برخلاف اسلام میں عطاءِ جاگیر کا معنی یہ ہے کہ تین صورتوں میں کسی کو جاگیر دی جاسکتی ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ارضِ موات دے دی گئی، یعنی بنجر زمین دی گئی اور کہا گیا کہ تم اس کو آباد کر کے اپنی ملکیت میں لے آؤ، اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کرے، اگر اس نے تین سال

کے اندر آباد کر لیا تب تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اگر وہ تین سال کے اندر اندر اس کو آباد نہ کر سکا تو جاگیر ختم، پھر وہ اس کو نہیں لے سکتا۔ (۱)

آپ دیکھیں گے کہ اس شرط پر کسی کو جاگیر دی جائے کہ تم اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کر لو تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنجر زمینیں آباد ہوں گی اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ آدمی خود تنہا اس کو آباد نہیں کر سکتا، اس کو کچھ مزدور رکھنے پڑیں گے تو لوگوں کو روزگار ملے گا اور اگر تین سال میں یہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو جاگیر ختم، واپس لے کر کسی اور کو دی جائے گی تو اس میں مفاسد ہونے کا احتمال ہی نہیں۔

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر عطا فرمائی۔ انہوں نے کچھ حصہ تو آباد کیا اور زیادہ تر حصہ آباد نہ کر سکے، لہٰذا بعد میں وہ جاگیر ان سے واپس لے لی گئی۔ (۲)

بعض لوگ تحدیدِ ملکیت والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگیر واپس لے لی، تو وہ اس لیے واپس لی کہ انہوں نے تین سال تک اسے آباد نہیں کیا، اگر آباد کیا ہوتا تو واپس نہ لیتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی زمین جو سرکاری ملکیت ہے بطور حصہ دے دی جائے۔ اسلام میں بنجر زمین سرکاری ملکیت نہیں ہوتی، سرکاری

---

(۱) الخراج لابن آدم ص۸۶ حدیث (۲۸۷) طبع المکتبۃ السلفیۃ۔ نیز ملاحظہ ہو فقہ حنفی کی مشہور کتاب بدائع الصنائع ۱۹۴/۶ کتاب الاراضی/انواع الاراضی وبیان حکم کل نوع منہا۔

(۲) دیکھئے الخراج لابن آدم ص۸۹ (۲۹٤)۔

زمین وہ ہوتی ہے جس بنجر زمین کو سرکار نے آباد کیا، ان زمینوں میں سے کوئی زمین کسی کو بطور مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی جائے کہ ہم تمہیں یہ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دیتے ہیں، تم اس کو استعمال کرو۔ اس میں یہ قید نہیں ہوتی کہ تین سال تک آباد نہیں کی تو واپس لے لی جائے گی۔

لیکن اس قسم کی جاگیر صرف اراضی سلطانیہ میں ہوسکتی ہے جس کی مالک صرف حکومت ہو، لیکن ایسی اراضی سلطانیہ جو حکومت نے پہلے سے آباد کرکے اپنی ملکیت بنا رکھی ہیں ان کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ ان کو بڑے پیمانے پر کسی کو بطور جاگیر دینا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ حکومت جس زمین کو آباد کرتی ہے وہ اپنے کسی مقصد کے تحت کرتی ہے اور اس میں بھی امام اس بات کا پابند ہے کہ مصلحت عامہ کو مدنظر رکھے یہ نہیں کہ کسی کو رشوت دے دی، یا کسی کو نواز دیا، بلکہ جہاں واقعی کوئی شخص حاجت مند ہے اس کو دیں، غریب لوگوں کو یا کسی خدمات کے صلہ میں دیں۔ ویسے ہی بغیر مصلحت کے دینا امام کے لیے جائز نہیں اور جو دے گا اس کی مقدار بھی کم ہوگی کیونکہ اراضی سلطانیہ کی مقدار کم ہوتی ہے، غلطی یہاں لگتی ہے کہ لوگ اراضی سلطانیہ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی غیر آباد زمین پڑی ہوئی ہے وہ حکومت کی ملکیت ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کی ملکیت اور مالکانہ حقوق تو نہیں دیے، لیکن زمین کی منفعت دے دی کہ زمین تو سرکار کی ہے، لیکن تم اس میں معین مدت تک کاشت کرکے پیسے حاصل کرسکتے ہو، یہ دوسری قسم سے بھی اضعف ہے۔ اس پر بھی وہ ساری حدود وقیود عائد ہیں جو دوسری قسم پر تھیں اور یہ کام بھی بڑے پیمانے پر نہیں ہوسکتا، اس کی تعداد بھی محدود رہے گی۔

اور چوتھی صورت جو یورپ وغیرہ میں تھی کہ خراج وصول کرنے کا مالک بنادیا، اسلام میں یہ جائز نہیں جب تک کہ مقطع لہ یعنی جاگیردار مستحق زکوۃ نہ ہو، اگر وہ مستحق زکوۃ ہے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا کیونکہ عشر کا مصرف مستحقینِ زکوۃ اور فقراء ہیں۔

فرض کریں کہ اگر کسی کو کہہ دیا کہ تم وہاں کا عشر وصول کرلو اور وہ مستحق زکوۃ تھا، جونہی وہ عشر وصول کرنے کے بعد صاحبِ نصاب بنا، اگلے سال اس کو عشر وصول کرنے کا حق نہیں رہے گا تو یہ جاگیر چل ہی نہیں سکتی۔

پہلی تین قسمیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے دو قسمیں بڑی محدود ہیں۔ اگر زیادہ بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہے تو وہ پہلی قسم ہے یعنی ارضِ موات۔ لہٰذا اسلام میں زیادہ تر جو زمین دی گئی ہے وہ ارضِ موات ہی تھی اور اس میں بھی اس بات کی پابندی تھی کہ تین سال کے اندر اندر خود آباد کریں۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ ارض موات کو یا تو آدمی خود کاشت کر کے آباد کرے یا مزدوری کے ذریعے اجرت پر کرایہ پر دے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کسی شخص کو ارضِ موات دی گئی تھی خود کاشت کرنے یا مزدوروں سے کاشت کرانے کے بجائے وہ زمین مزارعت پر دے دی، بٹائی پر دے دی اور کاشت کاروں سے کہا کہ تم اس کو آباد کرو، جو کچھ پیداوار ہوگی وہ میرے اور تمہارے درمیان تقسیم ہوگی تو یہ عقدِ مزارعت فاسد ہے۔

اس لیے کہ عقدِ مزارعت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زمین کا مالک ہو، پھر کاشت کار سے عقدِ مزارعت کرسکتا ہے، ابھی جب کہ زمین آباد نہیں ہوئی وہ اس کا مالک نہیں بنا اور جب مالک نہیں بنا تو عقدِ مزارعت کیسا؟

لہٰذا اس صورت میں جو کاشت کار کام کر کے آباد کرے گا وہی اس کا مالک بن جائے گا، جاگیردار مالک نہیں بنے گا جو کاشت کار عملاً کام کرے گا

"من أحيىٰ أرضاً ميتاً فهى له"[1]

کے اصول کے مطابق وہی مالک بنے گا، جاگیردار اس صورت میں فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ خود آباد کرے یا اجرت دے کر مزدوروں سے آباد کرائے، ورنہ مالک نہیں بنے گا۔

یہ نظام صدیوں سے مسلمانوں کے اندر جاری رہا اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی زمینیں لوگوں کے پاس آئیں، لیکن اس قسم کا کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوا جو جاگیرداری نظام کے مفاسد میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ اس سے فائدہ ہوا ہے کہ غیر آباد زمینیں آباد ہوئیں، ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا، لوگوں کو روزگار ملا اور عشر وخراج کی مقدار زیادہ ہوئی جس سے فقراء اور مساکین کو فائدہ پہنچا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان جاگیرداروں نے کوئی سیاسی یا معاشی تسلط حاصل کر کے امراء اور خلفاء کو اپنے فیصلوں کا تابع بنایا اور اپنی جاگیروں کو فساد کا ذریعہ بنایا ہو۔

اس لیے اسلام میں عطاءِ جاگیر کا جو تصوّر ہے وہ اس عطاءِ جاگیر سے بالکل مختلف ہے جو یورپ میں شروع ہوا اور بعد میں ایشیا میں پھیلا، البتہ پاکستان، ہندوستان اور برصغیر میں چونکہ مدتوں تک انگریز کا تسلط اور انگریز کے اثرات رہے، اس وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں بعض علاقوں میں اس قسم کا

---

(۱) سنن ابی داود ۱۷۸/۳ (۳۰۷۳) وسنن الترمذی ۵۵/۳ (۱۳۷۸-۱۳۷۹) وقال هذا حديث حسن صحيح۔

جاگیرداری نظام رائج رہا جو یورپ میں تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرداری نظام میں بھی اسی قسم کے نظام کے باقی ماندہ اثرات ہیں جن کو ختم کرنا ضروری ہے۔

انگریز کی عطا کردہ جاگیریں

انگریز کے زمانے میں لوگوں کو بہت سی ایسی جاگیریں عطا کی گئیں جو اسلام میں پہلی قسم کی ہیں، یعنی بنجر زمین کے مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئیں۔ اس کے دو پہلو ہیں:

بعض مرتبہ وہ اراضی بطور رشوت دی گئیں اور رشوت بھی مسلمانوں سے غداری کرنے پر جس وقت مسلمان انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے، انگریز نے مسلمانوں میں ہی کچھ لوگوں کو ان کا جاسوس مقرر کر رکھا تھا، وہ مسلمانوں سے غداری کر کے انگریز کو خبریں پہنچایا کرتے تھے کہ فلاں لوگ آپ کے خلاف یہ سازش کر رہے ہیں، انگریز کے ہاں اس جاسوسی کی بڑی قیمت تھی۔ اس غداری کے نتیجے میں بطور رشوت یا بطور اجرت (اسلامی نقطۂ نظر سے وہ رشوت ہی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے غداری کی اجرت ہے) ان کو زمینیں اور جاگیریں دی گئیں۔

غداری کے عوض حاصل کردہ جاگیروں کا حکم

اس طرح غداری کے عوض جو زمینیں یا جاگیریں دی گئیں شرعاً ان کا جاگیرداروں کو اپنے پاس رکھنا جائز ہی نہیں، اس لیے کہ معقود علیہ غداری ہے، لہٰذا اس کی اجرت میں جو کچھ ملا وہ بھی حرام ہے ان کے لیے ان کو اپنے پاس

رکھنا بھی حرام ہے۔

البتہ اگر انہوں نے ان زمینوں کو آباد کر لیا ہو تو ان پر ان کی ملکیت ثابت ہو جائے گی یا نہیں؟ یہ بات محل نظر ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احیاء سے ملک تب آتی ہے[1] جب حکومت نے اس کی اجازت دی ہو اور یہاں جو اجازت دی گئی، وہ چونکہ غداری کے صلے میں ملی تھی اس لیے اس کا معتبر ہونا محل نظر ہے۔

کسی خدمت کے صلے میں دی گئی انگریزی حکومت کی جاگیر کا حکم

جو جاگیریں غداری کے نتیجے میں نہیں، بلکہ کسی خدمت کے عوض دی گئیں وہ صحیح ہیں اس میں اسلامی اعتبار سے شرط یہ ہے کہ جاگیردار نے اس کو اسلامی طریقہ سے آباد کر لیا ہو، اگر اس نے آباد کر لیا، چاہے خود کیا ہو یا مزدوروں سے آباد کرا لیا ہو تو اس کی ملکیت صحیح ہوگئی، لیکن اگر آباد نہیں کیا تو جتنے حصے کو آباد نہیں کیا وہ اس کی ملکیت میں نہیں آیا۔

سرحد اور پنجاب کے شاملات کا حکم

سرحد اور پنجاب کے شاملات کے علاقے اسی قسم کے ہیں انگریز نے نام لکھ دیے کہ فلاں کے لیے ہے، لیکن ان لوگوں نے اس میں آبادکاری کا کوئی کام نہیں کیا، اس لیے وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی، لیکن جن کو آباد کر لیا وہ ان کی ملکیت میں آگئیں۔

(۱) بدائع الصنائع ۶/۱۹٤۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے دور میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دوسری قسم بھی ملکیت میں نہیں آتی (جس کو آباد کرلیا ہو)۔ اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز کے قبضے سے پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی اس لیے ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں، انگریز نے جو قبضہ کیا وہ ناحق تھا، جب قبضہ ناحق تھا تو کسی کو جاگیر دینے کا بھی کوئی حق نہ تھا، اگر کسی کو دے گا تو وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔

لیکن درحقیقت یہ دلیل درست نہیں، یہ جذباتی دلیل ہے فقہی دلیل نہیں، اس لیے کہ فقہ کا مسلمہ اصول ہے اس طور پر کہ حنفیہ کے نزدیک اگر مسلمانوں کی زمین پر کافروں کا استیلاء ہوجائے تو کافر اس کے مالک بن جاتے ہیں، استیلاءِ کفار موجبِ ملک ہوتا ہے، اصول الشاشی(۱) وغیرہ میں اشارۃ النص کی مثال ہے

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

قرآنِ کریم نے ان مہاجرین کو، جو مکہ مکرمہ میں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے، فقراء قرار دیا، اس واسطے کہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں، حالانکہ وہاں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کے آئے ہیں جن پر مشرکین قابض ہوگئے تھے۔

---

(۱) اصول الشاشی ص ۱۰۱ فصل فی متعلقات النصوص-طبع دار الکتاب العربی۔ وبدائع الصنائع ۱۲۸/۷ کتاب السیر / فصل فی بیان حکم الاستیلاء من الکفرۃ علی اموال المسلمین۔

معلوم ہوا کہ مشرکین کے اس قبضے کو اسلام نے تسلیم کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ ان کی ملکیت سے نکالی گئیں، تو استیلاءِ کفار موجبِ ملک ہوتا ہے، انگریز جب پاکستان اور ہندوستان کی اراضی پر قابض ہوا تو وہ اراضی اس کی ملکیت میں آگئیں، اب وہ جس کو دیں وہ اس کا مالک بن جائے گا۔ جب کہ مشروع طریقے سے دینا ہو، بطور رشوت یا غداری کی اجرت کے طور پر نہ ہو اور یہ جو زمین اور جاگیریں ہیں ان میں دونوں قسم کی ہیں، بعض وہ ہیں جو غداری کے صلہ میں دی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو صحیح خدمات کے صلہ میں دی گئی ہیں۔

کیا انگریزوں کی عطا کردہ سب جاگیریں غلط ہیں؟

لہٰذا یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ انگریزوں نے جتنی جاگیریں دی ہیں سب غلط ہیں سب سے واپس لینی چاہیے، یہ بات شرعی اعتبار سے بھی درست نہیں، اس کا مطلب ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیس دیا جائے، جو جائز طریقے سے مالک بنے ہیں ان کو محروم کر دیا جائے، یہ بات درست نہیں۔

ہمارے ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے ان احکام کو مدنظر رکھے بغیر بلا استثنا یہ کہہ دیا کہ یہ زمینیں سب سے واپس لی جائیں گی، چاہے یہ بات دینی جماعتوں نے کہی ہو یہ بات شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، بلکہ اس تفصیل کے مطابق واپس لینا درست ہوگی کہ جن کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ انہوں نے غداری کر کے حاصل کی ہیں۔

یہ عجیب قصہ ہے کہ کہتے ہیں کہ سو ایکڑ چھوڑ دیں گے، باقی واپس لے لیں گے، پچاس ایکڑ چھوڑ دیں گے اور باقی واپس لیں گے۔ اگر حرام ہے تو پوری حرام

ہے اور اگر حلال ہے تو پوری حلال ہے، اس میں سو ایکڑ اور پچاس ایکڑ کا کوئی معنی نہیں، اگر کسی نے غداری کے عوض لی ہے تو سو ایکڑ کیا ایک انچ زمین بھی اس کے پاس چھوڑنا حرام ہے اور اگر کسی نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے تو وہ ہزار ایکڑ ہو تب بھی اس کے لیے جائز ہے۔اس واسطے جو سیاسی پروپیگنڈا ہے اس کا فقہی اور شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں، حقیقتِ حال وہ ہے جو عرض کردی گئی۔

مزارعت کا حکم

بعض لوگ جاگیری نظام کا ذکر کرتے ہوئے مزارعت کو بھی اس کی لپیٹ میں لے کر کہتے ہیں کہ زمین دارانہ نظام بھی ختم کرنا چاہیے۔حالانکہ زمین دارانہ نظام کی جو خرابیاں ہیں وہ درحقیقت زمین دارانہ نظام کی خرابیاں نہیں ہیں، بلکہ افراد کے غیر شرعی طرزِ عمل کی خرابیاں ہیں۔

ہمارے بعض معاشروں میں خاص طور پر پنجاب یا سرحد کے بعض علاقوں میں یوں ہوتا ہے کہ زمین دار ناجائز شرطیں عائد کرتا ہے کہ ہم تم کو زمین کاشت کے لیے مزارعت پر دے رہے ہیں، لیکن تمہیں فلاں فلاں شرطوں کی پابندی کرنی ہوگی، ہماری بیٹی کی شادی ہوگی تو تمہیں اتنا غلہ فراہم کرنا ہوگا، ہمارے بچے کی ختنہ ہوگی تو تمہیں اتنا گھی لا کر دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ اور بیگار یعنی ایسی محنت جس کا کوئی صلہ نہیں وہ ان پر عائد کی جاتی ہے، مثلاً ہم کوٹھی بنارہے ہیں ہمارے گھر کی تعمیر کرو، کوئی صلہ یا اجرت نہیں، تو اس قسم کی باتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اس نے زمین دارانہ نظام کو خراب کردیا ہے۔

دوسرا یہ کہ مزارع کا سماجی رتبہ بہت فروتر بنایا ہوا ہے، یہاں تک کہ پنجاب میں اس کو کمی کہتے ہیں، کمی کے معنی ہیں کمینہ، تو کاشت کار کا نام کمی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارا کمی ہے، اس کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے، یہ سب باتیں ناجائز اور حرام ہیں، نفسِ مزارعت کے اندر کوئی خرابی نہیں اگر دو آدمیوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر معاملہ ہو جیسا کہ دو شریکوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے، خرابی ان شرائط فاسدہ کی وجہ سے ہے، ان شرائطِ فاسدہ کو دور کرنا چاہیے۔

سودی رہن رکھنا

ان مفاسد کے علاوہ ایک بہت بڑا رواج سودی رہن کا ہے کہ قرضہ دیا اور زمین رہن رکھ لی، قرض دینے والا اس میں کاشت کر رہا ہے اور قرضے سے کئی گنا زیادہ اس زمین سے وصول کر چکا، لیکن پھر بھی زمین نہیں چھوڑ رہا۔

اس قسم کے بعض مسائل ہیں جنہوں نے ہمارے نظامِ اراضی کو خراب کیا ہے اور اشتراکیت کا جو پروپیگنڈہ ہے کہ زمین داری نظام ہی غلط ہے اس سے مرعوب ہونے کے بجائے نظامِ اراضی کی اصلاح کا جو صحیح طریقہ شریعت نے مقرر کیا وہ اختیار کرنا چاہیے۔

سوال: اندرونِ سندھ میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہاریوں میں زمینیں تقسیم کی جاتی ہیں، جب حکومت بدلتی ہے تو نئی حکومت ان زمینوں کو دوبارہ ضبط کر لیتی ہے اور اپنے بعض حامیوں کو دے دیتی ہے، بعض دفعہ بنجر زمینیں بھی ہوتی ہیں جن کو سلطان نے آباد نہیں کیا، آیا ایسی زمینیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جب حکومت بنجر زمین دے رہی ہے تو اس کو لینا اور آباد کرنا جائز ہے اور آباد کرنے سے وہ مالک ہوجائے گا، اس کے بعد اگر دوسری حکومت واپس لے گی تو اس کے لیے وہ لینا شرعاً جائز نہیں، ہم نے سپریم کورٹ میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ اگر کسی کے ساتھ ایسا ہوا ہے تو وہ عدالت میں دعوی کر کے واپس لے سکتا ہے۔ (۱)

زمین کی وراثت کا مسئلہ

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے نظامِ اراضی میں ایک بہت بڑا فساد وراثت کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ خاص طور پر پنجاب میں وراثت کے شرعی احکام زمینوں پر جاری نہیں کرتے، بیٹیوں کو زمینوں میں حصہ نہیں ملتا۔

تو زمینوں میں وراثت کے جاری نہ ہونے کے نتیجے میں زمینوں میں ارتکاز پیدا ہوگیا ہے، اگر وراثت کے شرعی احکام جاری ہوتے تو کبھی بھی اتنے بڑے بڑے رقبے ایک آدمی کی ملکیت نہ رہتے۔ سو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اگر اس میں وراثت جاری ہوئی ہوتی تو آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ رہنے کا تصور بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ خود بخود تقسیم ہوجاتی۔

آج بھی اگر کوئی اسلامی حکومت آئے تو اس پر واجب ہے کہ اس دن سے وراثت کے احکام جاری کرے اس لیے کہ جن لوگوں کے حقوق ختم کیے گئے، زائل کیے گئے یا مارے گئے اس کے حقوق مرورِ ایام سے ضائع نہیں ہوئے،

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں ''عدالتی فیصلے'' جلد دوم، صفحہ ۱۵ تا ۲۰۱۔

اس لیے اس دن سے وراثت جاری ہوگی، اگر ایسا ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ تو درکنار پانچ سو ایکڑ بھی نہیں ہوگی۔

اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید ملکیت نہیں کی، اس واسطے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدیدِ ملکیت کی جاتی ہے وہ کبھی نہیں چلتی۔ یہ تحدید ایوب خان نے کی، پھر بھٹو صاحب نے کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنے والوں نے یہ کیا کہ ٹھیک ہے بھائی، پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہو سکتی تھی، اب جس کے پاس پانچ ہزار ایکڑ ہے اس نے چار ہزار ایکڑ اپنے ان چار ہاریوں کے نام کر دیں جن بے چاروں کو پتہ تک نہیں کہ یہ ان کے نام ہے، ان سے کہا گیا کہ یہاں انگوٹھا لگا دیں، انہوں نے انگوٹھا لگا دیا کہ میں نے ایک ہزار ایکڑ وصول کر لی، اب وہ اس کے نام پر آ گئی، نام بدل گئے، لیکن ہے وہ پانچ ہزار اسی کی۔ بھٹو صاحب مرحوم نے سو ایکڑ کی تحدید کر دی، اس نے دس ہاریوں کے نام کر دی، تو اس کے پاس تو پانچ ہزار ایکڑ ہی رہی، لیکن نام بدل گئے تو گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید ہوتی ہے وہ سوائے فراڈ کے اور کچھ نہیں ہوتا، اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید نہیں کی، لیکن نظام ایسا بنایا ہے کہ مآلِ کار کوئی آدمی زیادہ رقبے کا مالک نہیں رہ سکتا۔

جب میراث جاری ہوگی تو ایک آدمی کے انتقال سے ایک رقبہ زمین آٹھ دس حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور اس کا بھی انتقال ہو گیا تو اور زیادہ تقسیم ہو جائے گی، تو اس طرح کبھی بڑا رقبہ ایک آدمی کی ملکیت نہیں رہ سکتا، جس کے نتیجے میں وہ مفاسد جو آج پیدا ہو رہے ہیں یہ پیدا نہیں ہوں گے۔

آج شریعت کے احکام پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کہتے ہیں کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تقسیم کرو اور باقی چھین لو جس کا نہ شرعی جواز ہے اور نہ ہی یہ مسئلہ کا صحیح حل ہے۔

سوال: اگر ایک حکومت سے کم قیمت میں یا ناجائز طریقے سے کوئی زمین حاصل کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر زمین کی سرکاری طور پر کچھ قیمت متعین ہوتی ہے، اگر امام سرکاری قیمت کے مطابق دے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ وہ بازار کی زمینوں سے غبنِ فاحش نہ ہو۔

لیکن اگر غبنِ فاحش ہے تو غبنِ فاحش کے ساتھ کسی کو دینا درست نہیں ہے۔ امام کو حق نہیں ہے کہ بیت المال کی زمین سے کسی کو غبن فاحش کے ساتھ سستی قیمت پر دے دے، اگر دے گا تو وہ ناجائز ہوگا اور اگر کسی نے رشوت کے طور پر لی ہے تو وہ بطریقِ اولیٰ ناجائز ہے۔

سوال: انگریز نے لوگوں کو جو زمینیں دی ہیں یہ تقریباً ایک صدی پہلے کا واقعہ ہے اور انگریز رخصت ہو چکا ہے، آج کے دور میں اس عطاء کے گواہ اور ریکارڈ بھی نہیں ہے؟

جواب: میں نے ذاتی طور پر اس کی تحقیق کی ہے، ایک ایک زمین اور ایک ایک چپہ کا ریکارڈ موجود ہے، لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ریکارڈ نہیں ہے، کس کو دی گئی؟ اصلاً کس کے نام ہے اور کس کو منتقل ہوئی؟ سب کچھ موجود ہے، ویسے انگریز کا نظام حکومت بڑا زبردست تھا، ہمارے ہاں ہندوستان و پاکستان میں جو زمینیں تھیں مغلیہ دور میں ان کا باقاعدہ منظم ریکارڈ نہیں تھا، انگریز نے آ کر اس

کے ایک ایک چپے کا ریکارڈ بنالیا، اس کے ریکارڈ کے دو طریقے ہیں:

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بندوبست کے دفاتر میں ریکارڈ موجود ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نے کتابیں لکھ کر چھاپ دیں، ہر ضلع اور ڈویژن کا ریکارڈ لکھ دیا، یہ چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ میں جس زمانے میں اس کی تحقیق کر رہا تھا، ہزارہ کے ایک گاؤں کا مسئلہ تھا اس موضوع پر مجھے فیصلہ لکھنا تھا اس لیے مجھے تحقیق کرنی پڑی، اس وقت دیکھا کہ انگریز نے انتظام کے اندر کیا کمال دکھایا ہے، اس نے ایک ایک گاؤں، ایک ایک گلی، ایک ایک رقبے کا ریکارڈ بنایا ہے، نہ یہ کہ صرف دفتروں میں ہے، بلکہ کتابوں کی شکل میں چھاپ کے رکھ دیا ہے اور وہاں کے جو رسم ورواج تھے سارے تفصیل سے لکھ کر چلا گیا ہے کہ فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا، فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا وغیرہ۔

پہلے یہ تھا اور اب یہ ہے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تک یہ رواج رہا، یہ ہوا وہ ہوا وہ سب لکھ کر چلا گیا، اس واسطے یہ ریکارڈ نکالنا مشکل نہیں ہے۔ اگر حکومت ایک اراضی کمیشن بنادے کہ بھائی تم چھان بین کرو تو کوئی دشواری نہیں ہے، بڑے آرام سے نکل آئے گا اور اطمینان سے اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو بھی چھوڑو، صرف وراثت کے احکام جاری کردو، پھر دیکھو ان بڑے بڑے رقبوں کا کیا بنتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حقوق وفرائض
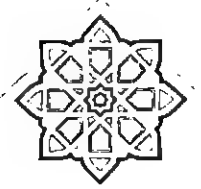
(ذکر وفکر ص ۹۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقوق وفرائض

شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے ماضی قریب کی ان شخصیتوں میں سے تھے جن کی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں، ان کا اردو ترجمۂ قرآن اور تفسیر مشہور و معروف ہے۔ اس کے علاوہ آزادیٔ ہند کے سلسلے میں ان کی تحریک ریشمی رومال اور تحریکِ خلافت میں ان کی سرگرم خدمات ہماری تاریخ کا روشن باب ہیں، وہ دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے اور پھر تعلیم سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں عمر بھر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ''شیخ الحدیث'' کے منصب پر فائز ہوئے اور ماضی قریب کے بے شمار مشاہیر نے ان کی شاگردی کا اعزاز حاصل کیا۔

جب وہ دارالعلوم دیوبند میں ''شیخ الحدیث'' کے طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے محسوس کیا کہ اُن کی تنخواہ اُن کے منصب، ان کے علم وفضل اور ان کی خدمات کے لحاظ سے بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، ان کا کوئی اور ذریعۂ آمدنی بھی نہیں ہے اور ضروریات

بڑھتی جارہی ہیں، چنانچہ مجلس شوریٰ نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ مولانا (رحمۃ اللہ علیہ) کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے اور اس مضمون کا ایک حکم نامہ مجلس شوری کی طرف سے جاری کردیا گیا۔

جوصاحب مولانا کے پاس مجلس شوری کے فیصلے کی خبر لے کر گئے انہیں یقیناً یہ امید ہوگی کہ مولانا یہ خبرسن کرخوش ہوں گے، لیکن معاملہ برعکس ہوا، مولانا یہ خبرسن کر پریشان ہوگئے اور فوراً مجلسِ شوری کے ارکان کے نام ایک درخواست لکھی جس کا مضمون یہ تھا کہ

> ''میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دارالعلوم کی طرف سے میری تنخواہ میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ یہ اطلاع میرے لیے سخت تشویش کا موجب ہے، اس لیے کہ میری عمر کی زیادتی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے اب دارالعلوم میں میرے ذمے پڑھانے کے گھنٹے کم رکھے گئے ہیں، جبکہ اس سے پہلے میرے ذمے زیادہ گھنٹے ہوا کرتے تھے، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ مجلسِ شوری میری تنخواہ کم کرنے پر غور کرتی، چہ جائیکہ میری تنخواہ میں اضافے پر سوچا جائے۔ لہٰذا میری درخواست ہے کہ میری تنخواہ بڑھانے کا فیصلہ واپس لیا جائے اور اوقات کے لحاظ سے تنخواہ کم کرنے پر غور کیا جائے''۔

آج ہم جس ماحول میں جی رہے ہیں اس میں اگرکوئی ملازم اس مضمون کی درخواست اپنی انتظامیہ کے نام تحریر کرے تو یہی گمان ہوگا کہ اس درخواست

کے ذریعے ملازم نے اپنی انتظامیہ پر بھرپور طنز کیا ہے۔ وہ اپنی تنخواہ میں اضافے کی مقدار سے نہ صرف یہ کہ مطمئن نہیں ہے، بلکہ اسے انتظامیہ پر سنگین اعتراض ہے کہ اس نے یہ معمولی اضافہ کر کے اس کی توہین کی ہے، لہٰذا اس نے جلے کٹے لہجے میں یہ طنز آمیز خط تحریر کیا ہے۔

لیکن حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے جو درخواست لکھی تھی اس میں دور دور طنز کا کوئی شائبہ نہیں تھا، وہ واقعتاً یہ سمجھتے تھے کہ تنخواہ میں جو اضافہ ہوگا، شاید وہ ان کے کام کے لحاظ سے دیانتاً درست نہ ہو۔ اس لیے کہ اس ماحول میں ایسے حضرات کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اپنے تدریسی اوقات کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتے تھے، کہ یہ ان کا بکا ہوا وقت ہے جو کسی اور کام میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں ہر استاد کا معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات میں اپنا کوئی ضروری ذاتی کام پیش آجاتا یا ملازمت کے اوقات میں ان کے پاس کوئی ذاتی مہمان ملنے کے لیے آجاتا تو وہ گھڑی دیکھ کر اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے کہ اتنا وقت اپنے ذاتی کام میں صرف ہوا اور مہینے کے ختم پر ان اوقات کا مجموعہ بنا کر انتظامیہ کو از خود درخواست پیش کرتے تھے کہ اس ماہ ہماری تنخواہ سے اتنے روپے کاٹ لیے جائیں، کیونکہ اتنا وقت ہم نے دوسرے کام میں خرچ کیا ہے۔

یہ ہے اس فرض شناس معاشرے کی ایک ہلکی سی تصویر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں ہر طرف ''حقوق'' حاصل کرنے کی صدائیں

گونج رہی ہیں، اسی مقصد کے تحت بے شمار ادارے، انجمنیں اور جماعتیں قائم ہیں اور ہر شخص اپنے حقوق کے نام پر زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کی فکر میں منہمک ہے، لیکن اس پہلو کی طرف توجہ بہت کم لوگوں کو ہوتی ہے کہ حقوق (Rights) ہمیشہ فرائض (Obligations) سے وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ درحقیقت انہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جو شخص اپنے فرائض کما حقہ ادا نہ کرے، اس کے لیے اپنے متعلقہ حقوق کے مطالبے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلامی تعلیمات کا مزاج یہ ہے کہ وہ نہ صرف ہر فرد کو اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتی ہیں، بلکہ دل میں اصل فکر ہی یہ پیدا کرتی ہیں کہ کہیں مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی؟ اس لیے کہ ہوسکتا ہے میں اپنی ترکیبوں سے اس کوتاہی کو دنیا میں چھپالوں اور اس کے دنیوی نتائج سے محفوظ ہوجاؤں، لیکن ظاہر ہے کہ کوئی کوتاہی، خواہ وہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو، اللہ تعالی سے نہیں چھپا سکتا۔ جب یہ فکر کسی شخص میں پیدا ہوجاتی ہے تو اس کا اصل مسئلہ حقوق کے حصول کے بجائے فرائض کی ادائیگی بن جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے جائز حقوق بھی پھونک پھونک کر وصول کرتا ہے کہ کہیں وصول شدہ حق کا وزن ادا کردہ فریضے سے زیادہ نہ ہوجائے۔ یہی فکر تھی جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو وہ درخواست دینے پر مجبور کیا۔

اگر یہ فکر معاشرے میں عام ہوجائے تو سب کے حقوق خود بخود ادا ہونے شروع ہوجائیں اور حق تلفیوں کی شرح گھٹتی چلی جائے، اس لیے کہ ایک شخص کا فریضہ دوسرے کا حق ہے اور جب پہلا شخص اپنا فریضہ ادا کرے گا تو دوسرے کا حق خود بخود ادا ہوجائے گا، شوہر اپنے فرائض ادا کرے تو بیوی کے حقوق ادا ہوں

گے، بیوی اپنے فرائض ادا کرے تو شوہر کے حقوق ادا ہوں گے، افسر اپنے فرائض بجا لائے تو ماتحت کو اس کے حقوق ملیں گے اور ماتحت اپنے فرائض بجالائے تو افسر کو اس کے حقوق ملیں گے۔ غرض دوطرفہ تعلقات کی خوشگواری کا اصل راز یہی ہے کہ ہر فریق اپنی ذمے داری محسوس کر کے اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ بر آ ہو، تو دونوں میں سے کسی کو حق کی تلفی کی کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی۔

لیکن یہ فکر معاشرے میں اس وقت تک عام نہیں ہوسکتی، جب تک اس میں فکرِ آخرت کی آبیاری نہ کی جائے، آج ہم عقیدہ آخرت پر ایمان رکھنے کا زبان سے خواہ کتنا اعلان کرتے ہوں، لیکن ہماری عملی زندگی میں اس عقیدے کا کوئی پرتو عموماً نظر نہیں آتا۔ ہماری ساری دوڑ دھوپ کا محور یہ ہے کہ روپے پیسے اور مال و اسباب کی گنتی میں اضافہ کس طرح ہو؟ یہی بات زندگی کا اصل مقصد بن چکی ہے اور یہی ہماری ساری معاشی سرگرمیوں کا آخری مطمعِ نظر ہے۔

چنانچہ اگر ہم کہیں ملازمت کر رہے ہیں تو ہماری سوچ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اپنی تنخواہ اور گریڈ میں اضافہ کس طرح کیا جائے؟ اور ملازم کو حاصل ہونے والی دوسری سہولتیں زیادہ سے زیادہ کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں؟ اس کے لیے ہم انفرادی درخواستوں سے لے کر اجتماعی سودا کاری تک اور چاپلوسی سے لے کر دھونس دھاندلی تک، ہر حربہ استعمال کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن ہم میں یہ فکر رکھنے والے بہت کم لوگ ہیں (گو بحمد للہ نایاب نہیں) کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ ہماری کارکردگی کے لحاظ سے حلال بھی ہے کہ نہیں؟ جب اپنے لیے کچھ وصول کرنے کا وقت آئے تو ہمیں یہ حدیث تو خوب یاد ہوتی ہے کہ

''مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو''(۱)

لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت ہم میں سے بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ پسینہ واقعی نکلا بھی ہے کہ نہیں؟

اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقوق کے معاملے میں تو بہت حساس ہیں، لیکن فرائض کے معاملے میں حساس نہیں اور جب کسی بھی فریق کو اپنے فرائض کی فکر نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ سب کے حقوق پامال ہوتے ہیں، معاشرے میں جھگڑوں، تنازعات اور مطالبات کی چیخ پکار کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں اور کان بند ہوجاتے ہیں اور جب ضمیر کو موت کی نیند سلانے کے بعد کوئی کسی کی نہیں سنتا تو لوگ آخری چارہ کار اسی کو سمجھتے ہیں کہ جس کو جو چیز ہاتھ لگ جائے، لے بھاگے، چنانچہ نوبت چھینا جھپٹی اور لوٹ کھسوٹ تک پہنچ کر رہتی ہے۔

اپنے گردو پیش میں نظر دوڑا کر دیکھیں تو یہی منظر دکھائی دیتا ہے اور اس سے پریشان ہر شخص ہے، لیکن افراتفری کے اس عالم میں یہ سوچنے سمجھنے کی

---

(۱) سنن ابن ماجه ۹۳/۷ (۲٤٤۳) وقال البوصيری فی "مصباح الزجاجة" (۷۵/۳): هذا إسناد ضعيف، وهب بن سعيد هو عبد الوهاب بن سعيد، وعبد الرحمن بن زيد، وهما ضعيفان، لكن نقل عبد العظيم المنذري الحافظ في "كتاب الترغيب": إن عبد الرحمن بن زيد وثق، وقال: قال ابن عدي: أحاديثه حسان، قال: وهو ممن احتمله الناس، وصدقه بعضهم، وهو ممن يكتب حديثه، قال: ووهب ابن سعيد وثقه ابن حبان وغيره انتهى، فعلى هذا يكون الإسناد حسنا والله أعلم، وأصله في "صحيح البخاري" وغيره من حديث أبي هريرة، لكن إسناد المصنف ضعيف.

فرصت بہت کم لوگوں کو ہے کہ یہ صورت حال اس وقت تک تبدیل نہیں ہوگی۔ جب تک ہم میں سے ہر شخص فرائض کے احساس کو مقدم نہ رکھے یا کم از کم فرائض کو اتنی اہمیت تو دے جتنی اپنے حقوق کو دیتا ہے۔

اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشادِ گرامی ہمارے لیے بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے، بشرطیکہ ہم اس پر عمل کے لیے تیار ہوں، ارشاد ہے:

> "اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو اور اپنے بھائی کے لیے اس بات کو برا سمجھو جسے اپنے لیے برا سمجھتے ہو۔"(۱)

اس حدیثِ مبارک نے ہمیں یہ سنہرا اصول بتایا ہے کہ جب بھی کسی دوسرے شخص سے کوئی معاملہ کرنے کی نوبت آئے تو پہلے اپنے آپ کو اس دوسرے شخص کی جگہ کھڑا کر کے دیکھ لو کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے معاملے کی توقع کرتا؟ کون سی بات میرے لیے ناگواری کا موجب ہوتی؟ اور کس بات سے مجھے اطمینان ہوتا؟ بس اب دوسرے شخص کے ساتھ وہی برتاؤ کرو، جو اس وقت تمہارے لیے موجبِ اطمینان ہوسکتا تھا اور ہر اس بات سے پرہیز کرو جو ناگوار ہوسکتی تھی۔

اگر ایک افسر اپنے ماتحت کے ساتھ اپنا رویہ متعین کرتے وقت یہ معیار

---

(۱) مسند احمد ۳۶/۴۴۵ (۲۲۱۳۰) و ۳۶/۴۴۶ (۲۲۱۳۲) وأورده الهيثمي في "المجمع" ۱/۲۶۷ (۳۰۵) وقال: وفي الأولى رشدين بن سعد، وفي الثانية ابن لهيعة، وكلاهما ضعيف، رواهما أحمد. والمعجم الكبير للطبرانی ۲۰/۱۹۱ (۴۲۵)۔ وراجع الجامع للترمذی ۴/۱۴۰ (۲۳۰۵) قال الترمذی هذا حديث غريب.

اپنالے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کس قسم کے رویے کو انصاف کے مطابق سمجھتا؟ تو اس کے ماتحت کو کبھی اس سے کوئی جائز شکایت پیدا نہیں ہوسکتی، اس طرح اگر ماتحت اپنے کام کی نوعیت اور مقدار متعین کرتے وقت اس بات کو فیصلہ کن قرار دے کہ اگر میں اپنے افسر کی جگہ ہوتا تو میں انصاف کے ساتھ کتنے اور کیسے کام کی توقع کرتا؟ تو افسر کو اپنے ماتحت سے کوئی جائز شکایت نہیں ہوسکتی۔

یہ اصول صرف ماتحت اور افسر ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ دنیا کے ہر تعلق میں اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے، باپ، بیٹے، بہن بھائی، میاں، بیوی، ساس بہو، دوست واحباب، عزیز رشتہ دار، تاجر اور خریدار، حکومت اور عوام، غرض ہر قسم کے باہمی رشتوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے زندگی گزارنے کے لیے دُہرے معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے ہم کسی اور معیار کی توقع رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر دوسروں سے مطالبے کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے ہم نے کوئی اور معیار بنا رکھا ہے اور ان کے ساتھ معاملہ اسی معیار کے مطابق کرتے ہیں، اگر ہمارے لینے اور دینے کے پیمانے الگ الگ نہ ہوں، بلکہ دونوں صورتوں میں ہماری سوچ ایک جیسی ہو تو حق تلفیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دلوں میں فرائض کا احساس کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ درست ہے کہ کوئی ایک شخص تنِ تنہا معاشرے کے مزاج کو ایک دم نہیں بدل سکتا، لیکن وہ خود اپنے مزاج کو ضرور تبدیل کرسکتا ہے اور اپنے حلقہ اثر میں اس مزاج کو فروغ دینے کی ممکنہ تدابیر بھی اختیار کرسکتا ہے، کم از کم اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں میں فرض شناسی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش بھی کرسکتا ہے اور اگر وہ ایسا کرے تو کم از کم ایک گھرانے کو بھٹکنے سے بچا کر سیدھے راستے پر لانے کا کارنامہ اس کے نامہ اعمال کو جگمگانے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ پھر تجربہ
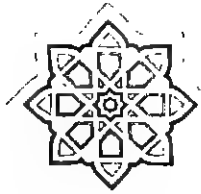
چوری یہ بھی ہے

(ذکر و فکر ص ۱۱۸)

چوری یہ بھی ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جارہے تھے، جب ریل میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن پہنچے تو محسوس کیا کہ ان کے ساتھ سامان اس مقررہ حد سے زیادہ ہے جو ایک مسافر کو بک کرائے بغیر اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوتی ہے، چنانچہ وہ اس کھڑکی پر پہنچے جہاں سامان کا وزن کر کے زائد سامان کا کرایہ وصول کیا جاتا ہے تاکہ سامان بک کرا سکیں۔ کھڑکی پر ریلوے کا جو اہلکار موجود تھا، وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جانتا تھا اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا، جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سامان بک کرنے کی فرمائش کی تو اس نے کہا کہ "مولانا! رہنے دیجیے، آپ سے سامان کا کیا کرایہ وصول کیا جائے؟ آپ کو سامان بک کرانے کی ضرورت نہیں، میں ابھی گارڈ سے کہہ دیتا ہوں" وہ آپ کو زائد سامان کی وجہ سے کچھ نہیں کہے گا۔"

مولانا نے فرمایا: یہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟

"غازی آباد تک" ریلوے افسر نے جواب دیا۔

پھر غازی آباد کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا نے پوچھا۔

"یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے بھی کہہ دے گا" اس نے کہا

مولانا نے پوچھا وہ دوسرا گارڈ کہاں تک جائے گا؟

افسر نے کہا "وہ کانپور تک آپ کے ساتھ جائے گا"

"پھر کانپور کے بعد کیا ہوگا؟ مولانا پوچھا۔

افسر نے کہا: "کانپور کے بعد کیا ہونا ہے؟ وہاں تو آپ کا سفر ختم ہوجائے گا۔"

حضرت نے فرمایا "میرا سفر تو بہت لمبا ہے کانپور پر ختم نہیں ہوگا، اس لمبے سفر کی انتہا تو آخرت میں ہوگی۔ یہ بتایئے کہ جب اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ اپنا سامان تم کرایہ دیے بغیر کیوں اور کس طرح لے گئے؟ تو یہ گارڈ صاحبان میری کیا مدد کرسکیں گے؟"

پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو سمجھایا کہ یہ ریل آپ کی یا گارڈ صاحب کی ملکیت نہیں ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، ریلوے کے محکمے کی طرف سے آپ کو یا گارڈ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جس مسافر کو چاہیں ٹکٹ کے بغیر یا اس کے سامان کو کرائے کے بغیر ریل میں سوار کردیا کریں، لہٰذا اگر میں آپ کی رعایت سے فائدہ اٹھا کر بغیر کرائے کے سامان لے بھی جاؤں تو یہ میرے دین کے لحاظ سے چوری میں داخل ہوگا اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس گناہ کا جواب دینا پڑے گا اور آپ کی یہ رعایت مجھے بہت مہنگی پڑے گی، لہٰذا براہِ کرم مجھ سے پورا پورا کرایہ وصول کر لیجیے۔ ریلوے کا وہ اہلکار مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھتا رہ گیا، لیکن

پھر اس نے تسلیم کیا کہ بات آپ ہی کی درست ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ) کے ساتھ پیش آیا۔ وہ ایک مرتبہ ریل میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن پہنچے، لیکن دیکھا کہ جس درجے کا ٹکٹ لیا ہوا ہے اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں، گاڑی روانہ ہونے والی تھی اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ جا کر ٹکٹ تبدیل کروالیں، مجبوراً اوپر کے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے، خیال یہ تھا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ تبدیل کرالیں گے، لیکن اتفاق سے پورے راستے میں کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہ آیا، یہاں تک کہ منزل آ گئی، منزل پر اتر کر وہ سیدھے ٹکٹ گھر پہنچے، وہاں جا کر معلومات کیں کہ دونوں درجوں کے کرائے میں کتنا فرق ہے؟ پھر اتنی ہی قیمت کا ایک ٹکٹ وہاں سے خرید لیا، اور وہیں پھاڑ کر پھینک دیا، ریلوے کے جس ہندو افسر نے ٹکٹ دیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ انہوں نے ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دیا ہے تو اسے سخت حیرانی ہوئی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہوا ہو۔ اس لیے اس نے باہر آ کر ان سے پوچھ گچھ شروع کردی کہ آپ نے ٹکٹ کیوں پھاڑا؟ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ اوپر کے درجے میں سفر کرنے کی وجہ سے یہ پیسے میرے ذمے رہ گئے تھے، ٹکٹ خرید کر میں نے یہ پیسے ریلوے کو پہنچا دیے، اب یہ ٹکٹ بے کار تھا، اس لیے پھاڑ دیا، وہ شخص کہنے لگا کہ "مگر آپ تو اسٹیشن سے نکل آئے تھے، اب آپ سے کون زائد کرائے کا مطالبہ کرسکتا تھا" والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ "جی ہاں، انسانوں میں اب تو کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں تھا، لیکن جس حق دار کے حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ ضرور کرتے ہیں، مجھے ایک دن ان کو منہ دکھانا

ہے، اس لیے یہ کام ضروری تھا"۔

یہ دونوں واقعات قیام پاکستان سے پہلے اُس دور کے ہیں جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے دل میں اس حکومت کے خلاف جو نفرت تھی وہ محتاج بیان نہیں، چنانچہ ملک کو انگریزی حکومت سے آزاد کرانے کی تحریکیں شروع ہوچکی تھیں، خود حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ برملا اپنی اس خواہش کا اظہار فرماچکے تھے کہ مسلمانوں کی کوئی الگ حکومت ہونی چاہیے جس میں وہ غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد ہوکر شریعت کے مطابق اپنا کاروبارِ زندگی چلاسکیں، لیکن انگریز کی حکومت سے متنفر ہونے کے باوجود اس کے قائم کیے ہوئے محکمے سے تھوڑا سا فائدہ بھی معاوضہ ادا کیے بغیر حاصل کرنا انہیں منظور نہ تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ چوری کی قانونی تعریف خود کچھ ہو، لیکن گناہ وثواب کے نقطہ نظر سے کسی دوسرے کی چیز اس کی آزاد مرضی کے بغیر استعمال کرنا چوری ہی میں داخل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دسیوں احادیث میں مختلف انداز سے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے، چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہے کہ

"حُرمَةُ مَالِ المُسْلِمِ كَحُرمَةِ دَمِهِ"(۱)

---

(۱) مسند البزار ۱۱۷/۵ (۱۶۹۹) وقال: وهذا الحديث لا نعلمه يروى عن عبد الله إلا من هذا الوجه بهذا الإسناد، ولا نعلم رواه عن الأعمش إلا أبو شهاب. وأورده الهيثمي في المجمع ٣٠٥/٤ (٦٨٦٥) وقال: ورجال البزار فيهم عمرو بن عثمان الكلابي، وثقه ابن حبان، وقال الأزدي: متروك. حلية الاولياء لابى نعيم ۳۳٤/۷ وقال: غريب من حديث الحسن والهجري، رواه إسماعيل بن أبي خالد، عن قيس بن أبي حازم، عن ابن مسعود مثله. (طبع السعادة مصر)۔ ومثله فى مسند أبى يعلى ۵۵/۹ (۵۱۹۹)=

"مسلمان کے مال کی حرمت بھی ایسی ہی ہے جیسے اس کے خون کی حرمت۔"

واضح رہے کہ حدیث میں اگرچہ مسلمان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن دوسری احادیث کی روشنی میں مسلمان حکومت کے غیر مسلم باشندے جو امن کے معاہدے کے ساتھ رہتے ہوں یا اس غیر مسلم حکوت کے غیر مسلم باشندے جس کے تحت مسلمان پر امن طور پر رہتے ہوں، ان کے جان و مال کا احترام بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مسلمان کے جان و مال کا احترام، لہٰذا اس لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ غیر مسلموں کی جان و مال قابل احترام نہیں ہے۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ"(۱)

"کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے"۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں جو خطبہ دیا، اس میں یہ بھی ارشاد ہے فرمایا کہ

"لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ مَالِ أَخِيهِ إِلَّا مَا طَابَتْ بِهِ نَفْسُهُ"(۲)

= وقال الهيثمی فی "المجمع" ۳۰۵/٤ (٦٨٦٥) وفيه محمد بن دينار، وثقه ابن حبان وجماعة، وقد ضعفه جماعة، وبقية رجال أبي يعلى ثقات.

(۱) مسند ابی یعلی ۱٤۰/۳ (۱۵۷۰) وأورده الهيثمي في "المجمع" ۳۰۵/٤ (٦٨٦٦) وقال: رواه أبو يعلى، وأبو حرة وثقه أبو داود، وضعفه ابن معين. والسنن الكبرى للبيهقی ۱٦٦/٦ (۱۱۵٤۵)

(۲) مسند احمد ۲۳۹/۲٤ (۱۵٤۸۸) وقال الهيثمي فی "المجمع" ۳۰۵/٤ (٦٨٦۳): ورجال احمد ثقات.

کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کا کوئی مال حلال نہیں سوائے
اس مال کے جو اس نے خوش دلی سے دیا ہو،

حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ یَأْخُذَ مَالَ أَخِیهِ بِغَیْرِ حَقٍّ، وَذٰلِکَ لِمَا حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ وَ أَنْ یَأْخُذَ عَصَا أَخِیهِ بِغَیْرِ طِیبِ نَفْسٍ"(۱)

کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا کوئی مال ناحق طور پر لے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا مال مسلمانوں پر حرام کیا ہے اور اس کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔

ان تمام احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ دوسرے کی کوئی چیز لینے یا استعمال کرنے کے لیے اس کا خوشی سے راضی ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی وقت حالات سے یہ معلوم ہوجائے کہ کسی شخص نے اپنی ملکیت استعمال کرنے کی اجازت کسی دباؤ کے تحت یا شرما شرمی میں دے دی ہے، وہ دل سے اس پر راضی نہیں ہے تو ایسی اجازت کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس کا استعمال بھی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہوگا۔

---

(۱) مسند احمد ۱۸/۳۹ (۲۳۶۰۵) ومسند البزار ۱۶۷/۹ (۳۷۱۷) وقال الهیثمی فی "المجمع" ۳۰٤/٤ (٦٨٥٩-٦٨٦١): رواه أحمد، والبزار، ورجال الجميع رجال الصحيح.

آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا بغور جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ہم چوری اور غصب بس یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے یا طاقت کا باقاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالانکہ کسی کی مرضی کے خلاف اس کی ملکیت کا استعمال، کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے۔ اس قسم کی چوری اور غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے، تاہم مثال کے طور پر اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

① ایک صورت تو وہی ہے جس کی طرف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ واقعے میں اشارہ کیا گیا ہے، آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیے بغیر نکال لائے، حالانکہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں اور اگر ان کی رضامندی سے کیا گیا، جبکہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئر لائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے چھوڑ دے، تو دوسری بات ہے۔

② ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ کر دوسرے شہروں میں مفت بات چیت نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی، بلکہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دے کر فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک گھٹیا

درجے کی چوری ہے اور اس کے گناہِ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

③ بجلی کے سرکاری محکمے سے کنکشن لے کر مفت بجلی کا استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جارہا ہے اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے۔

④ اگر ہم کسی شخص سے اس کی کوئی چیز مانگتے ہیں جب کہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ وہ زبان سے انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی نہ ہوگا اور دے گا تو محض شرما شرمی اور بادل ناخواستہ دے گا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے اور ایسی چیزوں کا استعمال حلال نہیں، کیونکہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آکر دی ہے۔

⑤ اگر کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لیے مستعار لی گئی اور وعدہ کرلیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائے گی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اس کے استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے۔ یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جبکہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں کا گناہ ہے۔

⑥ اگر کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لیے کرائے پر لی گئی، تو وقت گزر جانے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

⑦ اگر مستعار لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو، تو یہ غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے، مثلاً کسی بھلے مانس نے اگر اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ "مالِ مفت دلِ بے رحم" کا معاملہ کرے اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑائے پھرے کہ اس کے کل پرزے پناہ مانگنے لگیں۔ اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر طویل فاصلے کی کالیں دیر دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

⑧ بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لیے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو پسند ہوں، لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لیے ان کی معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہو کر کتابوں، اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا جائے، جبکہ خریدنے کی نیت نہ ہو تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آگئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیا جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

۱۷/ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
۲۹/مئی ۱۹۹۴ء
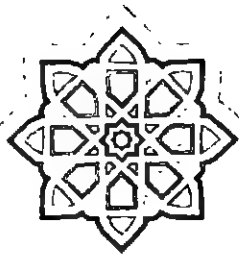
ناپ تول میں کمی

(اصلاحی خطبات ۷ / ۱۱۴)

ناپ تول میں کمی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ③ اَلَا

يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ (۱)

کم تولنا ایک عظیم گناہ

بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز! میں نے آپ حضرات کے سامنے سورۂ مطففین کی ابتدائی آیات تلاوت کیں، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بہت بڑے گناہ اور معصیت کی طرف متوجہ فرمایا ہے، وہ گناہ ہے ''کم ناپنا اور کم تولنا'' یعنی جب کوئی چیز کسی کو بیچی جائے تو جتنا اس خریدنے والے کا حق ہے اس سے کم تول کر دے، عربی میں کم ناپنے اور کم تولنے کو ''تطفیف'' کہا جاتا ہے اور یہ ''تطفیف'' صرف تجارت اور لین دین کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ''تطفیف'' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے کا جو بھی حق ہمارے ذمے واجب ہے اس کو اگر اس کا حق کم کر کے دیں تو یہ ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔

آیات کا ترجمہ

آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ کم ناپنے اور کم تولنے والوں کے لیے افسوس ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے ''ویل'' کا لفظ استعمال فرمایا، ''ویل'' کے ایک معنی افسوس کے آتے ہیں اور دوسرے معنی اس کے ہیں ''درد ناک عذاب'' اس دوسرے معنی کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ) ان لوگوں پر درد ناک عذاب ہے جو

(۱) سورة المطففين آيت (۱تا۶)۔

دوسروں کا حق کم دیتے ہیں اور کم ناپتے اور کم تولتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دوسروں سے اپنا حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو اس وقت اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں (اس وقت تو ایک دمڑی بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے)، لیکن جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دینے کا موقع آتا ہے تو اس وقت (ڈنڈی مار دیتے ہیں) کم کر دیتے ہیں، (جتنا حق دینا چاہیے اتنا نہیں دیتے)۔ (آگے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ) کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ ایک عظیم دن میں دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، جس دن سارے انسان رب العالمین کے سامنے پیش ہوں گے، (اور اس وقت انسان کو اپنے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں ہوگا اور اس دن ہمارا اعمال نامہ ہمارے سامنے آجائے گا، تو کیا ان لوگوں کو یہ خیال نہیں کہ اس وقت کم ناپ کر اور کم تول کر دنیا کے چند ٹکوں کو جو تھوڑا سا فائدہ اور نفع حاصل کر رہے ہیں، یہ چند ٹکوں کا فائدہ ان کے لیے جہنم کے عذاب کا سبب بن جائے گا۔ اس لیے قرآنِ کریم نے بار بار کم ناپنے اور کم تولنے کی برائی بیان فرمائی اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا واقعہ بھی بیان فرمایا)۔

قومِ شعیب علیہ السلام کا جرم

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اس وقت ان کی قوم بہت سی معصیتوں اور نافرمانیوں میں مبتلا تھی، کفر، شرک اور بت پرستی میں تو مبتلا تھی، اس کے علاوہ پوری قوم کم ناپنے اور کم تولنے میں مشہور تھی، تجارت کرتے تھے، لیکن اس میں لوگوں کا حق پورا نہیں دیتے تھے۔ دوسری طرف وہ ایک انسانیت سوز حرکت یہ کرتے تھے کہ مسافروں کو راستے میں ڈرایا کرتے اور ان

پر حملہ کر کے ان کو لوٹ لیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو کفر، شرک اور بت پرستی سے منع فرمایا اور توحید کی دعوت دی اور کم ناپنے کم تولنے اور مسافروں کو راستے میں ڈرانے اور ان پر حملہ کرنے سے بچنے کا حکم دیا، لیکن وہ قوم اپنی بد اعمالیوں میں مست تھی، اس لیے حضرت شعیب علیہ السلام کی بات ماننے کے بجائے ان سے یہ پوچھا کہ

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ (۱)

یعنی کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دے رہی کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آبا و اجداد عبادت کرتے تھے یا ہم اپنے مال میں جس طرح چاہیں تصرف کرنا چھوڑ دیں۔

یہ ہمارا مال ہے ہم اس کو جس طرح چاہیں حاصل کریں چاہے کم تول کر حاصل کریں یا کم ناپ کر حاصل کریں یا دھوکہ دے کر حاصل کریں، تم ہمیں روکنے والے کون ہو؟ ان باتوں کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام ان کو محبت اور شفقت کے ساتھ سمجھاتے رہے اور اللہ کے عذاب سے اور آخرت کے عذاب سے ڈراتے رہے، لیکن یہ لوگ باز نہ آئے اور بالآخر ان کا وہی انجام ہوا جو نبی کی بات نہ ماننے والوں کا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا عذاب بھیجا جو شاید کسی اور قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا۔

---

(۱) سورۃ ھود آیت (۸۷)۔

قوم شعیب علیہ السلام پر عذاب

وہ عذاب ان پر اس طرح آیا کہ پہلے تین دن متواتر پوری بستی میں سخت گرمی پڑی اور ایسا معلوم ہورہا تھا کہ آسمان سے انگارے برس رہے ہوں اور زمین آگ اگل رہی ہو۔ حبس اور تپش نے ساری بستی والوں کو پریشان کردیا۔ تین دن کے بعد بستی والوں نے دیکھا کہ اچانک بادل کا ایک ٹکڑا بستی کی طرف آرہا ہے اور اس بادل کے نیچے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، چونکہ بستی کے لوگ تین دن سے سخت گرمی کی وجہ سے بلبلائے ہوئے تھے اس لیے سارے بستی والے بہت اشتیاق کے ساتھ بستی چھوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہوگئے، تاکہ یہاں ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھائیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بادل کے نیچے اس لیے جمع کرنا چاہتے تھے تاکہ سب پر ایک ساتھ عذاب نازل کردیا جائے، چنانچہ جب وہ سب وہاں جمع ہوگئے تو وہی بادل جس میں سے ٹھنڈی ہوائیں آرہی تھیں، اس میں سے آگ کے انگارے برسنا شروع ہوگئے اور ساری قوم ان انگاروں کا نشانہ بن جھلس کر ختم ہوگئی۔ اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ سے اشارہ فرمایا کہ

فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ [1]

یعنی انہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا، اس کے نتیجے میں ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

---

[1] سورۃ الشعراء آیت (۱۸۹)۔

فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۱)

یعنی یہ ان کی بستیاں دیکھو، جو ان کی ہلاکت کے بعد آباد بھی نہیں ہوسکیں مگر بہت کم، ہم ہی ان کے سارے مال ودولت اور جائیداد کے وارث بن گئے۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کم ناپ کر، کم تول کر، ملاوٹ کرکے، دھوکہ دے کر ہم اپنے مال ودولت میں اضافہ کریں گے، لیکن وہ ساری دولت دھری کی دھری رہ گئی۔

یہ آگ کے انگارے ہیں

اگر تم نے ڈنڈی مار کر ایک تولہ، دو تولہ، ایک چھٹانک یا دو چھٹانک مال خریدار کو کم دے دیا اور چند پیسے کما لیے، دیکھنے میں تو یہ پیسے ہیں، لیکن حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں جس کو تم اپنے پیٹ میں ڈال رہے ہو۔ حرام مال اور حرام کھانے کے بارے میں قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۚ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (۲)

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، جو لقمے حلق سے نیچے اتر رہے ہیں یہ حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں، اگرچہ دیکھنے میں وہ روپیہ پیسہ اور مال ودولت نظر آرہا ہے، کیونکہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرکے اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی کرکے یہ پیسے

---

(۱) سورۃ القصص آیت (۵۸)۔

(۲) سورۃ النساء آیت (۱۰)۔

حاصل کیے گئے ہیں، یہ پیسے اور یہ مال و دولت دنیا میں بھی تباہی کا سبب ہیں اور آخرت میں بھی تباہی کا ذریعہ ہیں۔

عبادات میں کمی کرنا

اور یہ کم ناپنا اور کم تولنا صرف تجارت کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ کم ناپنا اور کم تولنا اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو امام المفسرین ہیں سورۂ مطففین کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "شدة العذاب يومئذ للمطففين من الصلاة والزكاة والصيام وغير ذلك من العبادات".[1]
>
> "یعنی قیامت کے روز سخت عذاب ان لوگوں کو بھی ہوگا جو اپنی نماز، زکوٰۃ اور روزے اور دوسری عبادات میں کمی کرتے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ عبادات میں کوتاہی کرنا، اس کو پورے آداب کے ساتھ ادا نہ کرنا بھی تطفیف کے اندر داخل ہے۔

مزدور کو مزدوری فوراً دے دو

ایک آقا مزدور سے پورا پورا کام لیتا ہے، اس کو ذرا سی بھی سہولت دینے کو

---

(۱) تنوير المقباس من تفسير ابن عباس ص ٥٠٤ طبع دار الكتب العلمية بيروت۔

تیار نہیں ہے، لیکن تنخواہ دینے کے وقت اس کی جان نکلتی ہے اور پوری تنخواہ نہیں دیتا، صحیح وقت پر نہیں دیتا، ٹال مٹول کرتا ہے، یہ بھی ناجائز ہے حرام ہے اور تطفیف میں داخل ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه"(۱)

"یعنی مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"۔

اس لیے کہ جب تم نے اس سے مزدوری کرا لی تو اب مزدوری دینے میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔

نوکر کو کھانا کیسے دیا جائے؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک نوکر رکھا اور نوکر سے یہ طے کیا کہ تمہیں ماہانہ اتنی تنخواہ دی جائے گی اور روزانہ دو وقت کا کھانا دیا جائے گا، لیکن جب کھانے کا وقت آیا تو خود خوب پلاؤ زردے اڑائے، اعلیٰ درجے کا کھانا کھایا اور بچا کھچا کھانا، جس کو ایک

(۱) سنن ابن ماجه ۹۳/۷ (۲٤٤۳) وقال البوصيري في "مصباح الزجاجة" (۷۵/۳): هذا إسناد ضعيف، وهب بن سعيد هو عبد الوهاب بن سعيد، وعبد الرحمن بن زيد، وهما ضعيفان، لكن نقل عبد العظيم المنذري الحافظ في "كتاب الترغيب": إن عبد الرحمن بن زيد وثق، وقال: قال ابن عدي: أحاديثه حسان، قال: وهو ممن احتمله الناس، وصدقه بعضهم، وهو ممن يكتب حديثه، قال: ووهب ابن سعيد وثقه ابن حبان وغيره انتهى، فعلى هذا يكون الإسناد حسنا والله أعلم، وأصله في صحيح البخاري وغيره من حديث أبي هريرة، لكن إسناد المصنف ضعيف.

معقول اور شریف آدمی پسند نہ کرے، وہ نوکر کے حوالے کردیا تو یہ بھی "تطفیف" ہے اس لیے کہ جب تم نے اس کے ساتھ دو وقت کا کھانا طے کرلیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو اتنی مقدار میں ایسا کھانا دو گے جو ایک معقول آدمی پیٹ بھر کر کھاسکے، لہٰذا اب اس کو بچا کھچا کھانا دینا اس کی حق تلفی اور اس کے ساتھ نا انصافی ہے لہٰذا یہ بھی "تطفیف" کے اندر داخل ہے۔

ملازمت کے اوقات میں ڈنڈی مارنا

یا مثلاً ایک شخص کسی محکمے میں، کسی دفتر میں آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، تو گویا کہ اس نے یہ آٹھ گھنٹے اس محکمے کے ہاتھ فروخت کردیے اور یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ میں آٹھ گھنٹے آپ کے پاس کام کروں گا اور اس کے عوض اس کو اجرت اور تنخواہ ملے گی۔ اب اگر وہ اجرت تو پوری لیتا ہے، لیکن اس آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کمی کرلیتا ہے اور اس میں سے کچھ وقت اپنے ذاتی کاموں میں صرف کرلیتا ہے تو اس کا یہ عمل بھی "تطفیف" کے اندر داخل ہے، حرام ہے، گناہ کبیرہ ہے، یہ بھی اسی طرح گناہ گار ہے جس طرح کم ناپنے والا اور کم تولنے والا گناہ گار ہے، اس لیے کہ اگر اس نے آٹھ گھنٹے کے بجائے سات گھنٹے کام کیا تو ایک گھنٹے کی ڈیوٹی ماردی گویا کہ اجرت کے وقت اپنا حق، یعنی اجرت تو پورا لے رہا ہے اور جب دوسروں کے حق دینے کا وقت آیا تو کم دے رہا ہے، لہٰذا تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہوگا جو اس وقت کے بدلے میں ہوگا جو اس نے اپنے ذاتی کاموں میں صرف کیا۔

ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا

کسی زمانے میں تو دفتروں میں ذاتی کام چوری چھپے ہوا کرتے تھے مگر آج کل دفتروں کا حال یہ ہے کہ ذاتی کام چوری چھپے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ کھلم کھلا، اعلانیہ، ڈنکے کی چوٹ پر کیا جاتا ہے، اپنے مطالبات پیش کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں کہ تنخواہیں بڑھاؤ، الاؤنس بڑھاؤ، فلاں فلاں مراعات ہمیں دو اور اس مقصد کے لیے احتجاج کرنے، جلسے جلوس کرنے اور نعرے لگانے کے لیے، ہڑتال کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ذمے کیا حقوق عائد ہو رہے ہیں؟ ہم ان کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم نے آٹھ گھنٹے کی ملازمت اختیار کی تھی، ان آٹھ گھنٹوں کو کتنی دیانت اور امانت کے ساتھ خرچ کیا، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں جاتا یاد رکھو! ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے، جو دوسرے کے حقوق میں کمی کرتے ہیں اور جب دوسروں سے حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو اس وقت پورا پورا لیتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک منٹ کا حساب ہوگا، اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ

آپ حضرات نے دارالعلوم دیوبند کا نام سنا ہوگا، اس آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے اس ادارے کو اس امت کے لیے رحمت بنایا اور یہاں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے صحابہ کرام کی یادیں تازہ کردیں۔ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا کہ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی

دور میں اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ دارالعلوم کے وقت میں اگر کوئی مہمان ملنے کے لیے آجاتا تو جس وقت وہ مہمان آتا اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ فرما لیتے اور یہ نوٹ کرلیتے کہ یہ مہمان مدرسے کے اوقات میں سے اتنا وقت میرے پاس رہا، پورا مہینہ اس طرح کرتے اور جب مہینہ ختم ہوجاتا تو اساتذہ ایک درخواست پیش کرتے کہ چونکہ فلاں فلاں ایام میں اتنی دیر تک میں مہمان کے ساتھ مشغول رہا اس وقت کو دارالعلوم کے کام میں صرف نہیں کرسکا۔ لہٰذا میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے۔

تنخواہ حرام ہوگی

آج تنخواہ بڑھانے کی درخواست دینے کے بارے میں تو آپ روزانہ سنتے ہیں، لیکن یہ کہیں سننے میں نہیں آتا کہ کسی نے یہ درخواست دی ہو کہ میں نے دفتری اوقات میں اتنا وقت ذاتی کام میں صرف کیا تھا، لہٰذا میری اتنی تنخواہ کاٹ لی جائے۔ یہ عمل وہی شخص کرسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی فکر ہو، آج ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے، مزدوری کرنے والے، ملازمت کرنے والے کتنا وقت دیانت داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر صرف کررہے ہیں؟ آج ہر جگہ فساد برپا ہے، خلقِ خدا پریشان ہے اور دفتر کے باہر دھوپ میں کھڑی ہے اور صاحب بہادر اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں مہمانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہیں، چائے پی جارہی ہے، ناشتہ ہورہا ہے، اس طرزِ عمل میں ایک طرف تو تنخواہ حرام ہورہی ہے اور دوسری طرف خلقِ خدا کو پریشان کرنے کا گناہ الگ ہورہا ہے۔

سرکاری دفاتر کا حال

ایک سرکاری محکمے کے ذمہ دار افسر نے مجھے بتایا کہ میرے ذمے یہ ڈیوٹی ہے کہ ملازموں کی حاضری لگاؤں، ایک ہفتے کے بعد ہفتہ بھر کا چٹھہ تیار کرکے افسر بالا کو پیش کرتا ہوں، تاکہ اس کے مطابق تنخواہیں تیار کی جائیں اور میرے محکمے میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو مار پیٹ والے نوجوان ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ اولاً تو دفتر میں آتے ہی نہیں ہیں اور اگر کبھی آتے ہیں تو ایک دو گھنٹے کے لیے آتے ہیں اور یہاں آکر بھی یہ کرتے ہیں کہ دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں، کینٹین میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں اور مشکل سے آدھا گھنٹے دفتری کام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں نے حاضری کے رجسٹر میں لکھ دیا کہ یہ حاضر نہیں ہوئے تو وہ لوگ پستول اور ریوالور لے کر مجھے مارنے کے لیے آگئے اور کہا کہ ہماری حاضری کیوں نہیں لگائی؟ فوراً ہماری حاضری لگاؤ۔

اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اگر حاضری لگاتا ہوں تو جھوٹ ہوتا ہے اور اگر نہیں لگاتا ہوں تو ان لوگوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنتا ہوں، میں کیا کروں؟ آج ہمارے دفتروں کا یہ حال ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کوتاہی

اور سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اس حق کی ادائیگی میں کمی کرنا بھی کم ناپنے اور کم تولنے میں داخل ہے۔ مثلاً نماز اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور نماز کا طریقہ بتادیا گیا ہے کہ اس طرح قیام کرو، اس طرح رکوع کرو، اس طرح سجدہ کرو، اس طرح اطمینان کے ساتھ سارے ارکان ادا کرو۔ اب آپ نے جلدی جلدی بغیر

اطمینان کے ایک منٹ کے اندر نماز پڑھ لی، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، نہ رکوع اطمینان سے کیا، تو آپ نے اللہ کے حق میں کوتاہی کردی۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صاحب نے جلدی جلدی نماز ادا کرلی، نہ رکوع اطمینان سے کیا، نہ سجدہ اطمینان سے کیا، تو ایک صحابی نے ان کی نماز دیکھ کر فرمایا:

"لقد طففت"

''تم نے نماز کے اندر 'تطفیف'' کی، یعنی اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہیں کیا''۔

(یہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''ابن حدیدہ'' نامی ایک صاحب سے کہا تھا جنہوں نے عصر کی نماز میں سستی سے کام لیا تھا۔)[1]

یاد رکھیے! کسی کا بھی حق ہو چاہے اللہ تعالیٰ کا حق ہو یا بندے کا حق ہو، اس میں جب کمی اور کوتاہی کی جائے گی تو یہ بھی ناپ تول میں کمی کے حکم میں داخل ہوگی اور اس پر وہ ساری وعیدیں صادق آئیں گی جو قرآنِ کریم نے ناپ تول میں کمی پر بیان کی ہیں۔

ملاوٹ کرنا حق تلفی ہے

اسی طرح ''تطفیف'' کے وسیع مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جو چیز فروخت کی وہ خالص نہیں، بلکہ اس کے اندر ملاوٹ کردی۔ یہ ملاوٹ کرنا کم ناپنے اور کم تولنے میں اس لحاظ سے داخل ہے کہ مثلاً آپ نے ایک سیر آٹا

(۱) ملاحظہ ہو موطا امام مالک ۱۷/۲ (۲۹) موسسۃ زاید بن سلطان آل نہیان ابوظبی۔

فروخت کیا، لیکن ایک سیر آٹے میں خالص آٹا تو آدھا سیر ہے اور آدھا سیر کوئی اور چیز ملادی ہے، اس ملاوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خریدار کا جو حق تھا کہ اس کو ایک سیر آٹا ملتا وہ حق اس کو پورا نہیں ملا، اس لیے یہ بھی حق تلفی میں داخل ہے۔

اگر تھوک فروش ملاوٹ کرے؟

بعض لوگ یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم خوردہ فروش ہیں، ہمارے پاس تھوک فروشوں کی طرف سے جیسا مال آتا ہے وہ ہم آگے فروخت کردیتے ہیں، لہٰذا اس صورت میں ہم ملاوٹ نہیں کرتے، ملاوٹ تو تھوک فروش کرتا ہے، لیکن ہمیں لامحالہ وہ چیز ویسی ہی آگے فروخت کرنی پڑتی ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے اگر ایک شخص خود مال نہیں بناتا اور نہ ملاوٹ کرتا ہے، بلکہ دوسرے سے مال لے کر آگے فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں خریدار کے سامنے یہ بات واضح کردے کہ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ اس میں کتنی اصلیت ہے اور کتنی ملاوٹ ہے، البتہ میری معلومات کے مطابق اتنی اصلیت ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔

خریدار کے سامنے وضاحت کردے

لیکن ہمارے بازاروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اصلی اور خالص ملتی ہی نہیں ہیں، بلکہ جہاں سے بھی لوگے وہ ملاوٹ شدہ ہی ملے گی اور سب لوگوں کو یہ بات معلوم بھی ہے کہ یہ چیز اصلی نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے، ایسی صورت میں وہ تاجر جو اس چیز کو دوسرے سے خرید کر لایا ہے اس کے ذمے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر ہر شخص کو اس چیز کے بارے میں بتائے، اس لیے کہ ہر شخص کو اس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ خالص نہیں ہے، لیکن اگر یہ خیال ہو

کہ خریدنے والا اس چیز کی حقیقت سے بے خبر ہے تو اس صورت میں اس کو بتانا چاہیے کہ یہ چیز خالص نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے۔

عیب کے بارے میں گاہک کو بتادے

اسی طرح اگر بیچے جانے والے سامان میں کوئی عیب ہو، وہ عیب خریدار کو بتا دینا چاہیے، تاکہ اگر وہ شخص اس عیب کے ساتھ اس کو خریدنا چاہتا ہے تو خرید لے ورنہ چھوڑ دے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من باع عيبا لم يبينه لم يزل في مقت الله، ولم تزل الملائكة تلعنه"[1]

"یعنی جو شخص عیب دار چیز فروخت کرے اور اس عیب کے بارے میں خریدار کو نہ بتائے کہ اس کے اندر یہ خرابی ہے تو ایسا شخص مسلسل اللہ کے غضب میں رہے گا اور ملائکہ ایسے آدمی پر مسلسل لعنت بھیجتے رہتے ہیں"۔

دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ بازار تشریف لے گئے، وہاں آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص گندم بیچ رہا ہے۔ آپ اس کے قریب تشریف لے گئے

---

(۱) سنن ابن ماجه ۳/۵۷۸ (۲۲٤۷) وقال البوصيري في "المصباح" ۳/۳۰: هذا إسناد ضعيف لتدليس بقية بن الوليد، وضعفه شيخه، قلت: رواه أبو بكر بن أبي شيبة بزيادة طويلة كما بينته في زوائد المسانيد العشرة من طريق أبي سباع عن واثلة بن الأسقع.

اور گندم کی ڈھیری میں ہاتھ ڈال کر اس کو اوپر نیچے کیا تو یہ نظر آیا کہ اوپر تو اچھا گندم ہے اور نیچے بارش اور پانی کے اندر گیلا ہو کر خراب ہو جانے والا گندم ہے، اب دیکھنے والا جب اوپر سے دیکھتا ہے تو اس کو یہ نظر آتا ہے کہ گندم بہت اچھا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا کہ تم نے یہ خراب والا گندم اوپر کیوں نہیں رکھا، تا کہ خریدار کو معلوم ہو جائے کہ یہ گندم ایسا ہے، وہ لینا چاہے تو لے لے، نہ لینا چاہے تو چھوڑ دے، اس شخص نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! بارش کی وجہ سے کچھ گندم خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو نیچے کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، بلکہ اس کو اوپر کر دو اور پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ

"من غش فليس منا"(۱)

جو شخص دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔

یعنی جو شخص ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کہ بظاہر تو خالص چیز بیچ رہا ہے، لیکن حقیقت میں اس میں کوئی دوسری چیز ملا دی گئی ہے یا بظاہر تو پوری چیز دے رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اس سے کم دے رہا ہے تو یہ غش اور دھوکہ ہے اور جو شخص یہ کام کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ دیکھیے ایسے شخص کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کیسی سخت بات فرما رہے ہیں، لہٰذا جو چیز بیچ رہے ہو اس کی حقیقت خریدار کو بتا دو کہ اس کی یہ حقیقت ہے، لیکن خریدار کو دھوکے میں اور اندھیرے میں رکھنا منافقت ہے، مسلمان اور مومن کا شیوہ نہیں ہے۔

(۱) صحیح مسلم ۱/۹۹(۱۰۲)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دیانتداری

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہم اور آپ سب مقلد ہیں، بہت بڑے تاجر تھے، کپڑے کی تجارت کرتے تھے، لیکن بڑے سے بڑے نفع کو اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے قربان کر دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے پاس کپڑے کا ایک تھان آیا، جس میں کوئی عیب تھا، چنانچہ آپ نے اپنے ملازموں کو جو دکان پر کام کرتے تھے کہہ دیا کہ یہ تھان فروخت کرتے وقت گاہک کو بتادیا جائے کہ اس کے اندر یہ عیب ہے۔ چند روز کے بعد ایک ملازم نے وہ تھان فروخت کردیا اور عیب بتانا بھول گیا، جب امام صاحب نے پوچھا کہ اس عیب دار تھان کا کیا ہوا؟ اس ملازم نے بتایا کہ حضرت میں نے اس کو فروخت کردیا۔ اب اگر کوئی اور مالک ہوتا تو وہ ملازم کو شاباش دیتا کہ تم نے عیب دار تھان فروخت کردیا، مگر امام صاحب نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کا عیب بتایادیا تھا؟ ملازم نے جواب دیا کہ میں عیب تو بتانا بھول گیا۔ تو آپ نے پورے شہر کے اندر اس گاہک کی تلاش شروع کردی جو وہ عیب دار تھان خرید کر لے گیا تھا۔ کافی تلاش کے بعد وہ گاہک مل گیا تو آپ نے اس کو بتایا کہ جو تھان آپ میری دکان سے خرید کر لائے ہیں اس میں فلاں عیب ہے، اس لیے آپ وہ تھان مجھے واپس کردیں اور اگر اسی عیب کے ساتھ رکھنا چاہیں تو آپ کی خوشی۔

آج ہمارا حال

آج ہم لوگوں کا حال یہ ہوگیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ عیب نہیں بتاتے، بلکہ جانتے ہیں کہ یہ عیب دار سامان ہے، اس میں فلاں خرابی ہے، اس کے باوجود

قسمیں کھا کھا کر یہ باور کراتے ہیں کہ یہ بہت اچھی چیز ہے، اعلیٰ درجے کی چیز ہے، اس کو خرید لیں۔

ہمارے اوپر یہ جو اللہ کا غضب نازل ہو رہا ہے کہ پورا معاشرہ عذاب میں مبتلا ہے، ہر شخص بد امنی، بے چینی اور پریشانی میں ہے، کسی شخص کی بھی جان، مال، آبرو محفوظ نہیں ہے۔ یہ عذاب ہمارے انہیں گناہوں کا نتیجہ اور وبال ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقوں کو چھوڑ دیا۔ سامان فروخت کرتے وقت اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے واضح نہیں کرتے۔ ملاوٹ، دھوکہ، فریب عام ہو چکا ہے۔

بیوی کے حقوق میں کوتاہی گناہ ہے

اسی طرح آج شوہر بیوی سے تو سارے حقوق وصول کرنے کو تو تیار ہے کہ وہ ہر بات میں میری اطاعت بھی کرے، کھانا بھی پکائے، گھر کا انتظام بھی کرے، بچوں کی پرورش بھی کرے، ان کی تربیت بھی کرے اور میرے ماتھے پر شکن بھی نہ آنے دے اور چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر رہے۔ یہ سارے حقوق وصول کرنے کو شوہر تیار ہے، لیکن جب بیوی کے حقوق ادا کرنے کا وقت آئے اس وقت ڈنڈی مار جائے اور ان کو ادا نہ کرے، حالانکہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو حکم فرمایا ہے کہ

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۱)

یعنی بیویوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۹)۔

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خيار كم خيار كم لنسائهم"(۱)

یعنی تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو۔

ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"استوصوا بالنساء خيرا"(۲)

یعنی عورتوں کے معاملے میں بھلائی کرنے کی نصیحت قبول کرو، یعنی ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔

اللہ اور اللہ کے رسول تو ان کے حقوق کی ادائیگی کی اتنی تاکید فرما رہے ہیں، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اپنی عورتوں کے پورے حقوق ادا کرنے کو تیار نہیں، یہ سب کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے اور شرعاً حرام ہے۔

مہر معاف کرانا حق تلفی ہے

ساری زندگی میں بے چاری عورت کا ایک ہی مالی حق شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے اور وہ ہے مہر، وہ بھی شوہر ادا نہیں کرتا۔ ہوتا یہ ہے کہ ساری زندگی تو مہر ادا نہیں کیا، جب مرنے کا وقت قریب آیا بستر مرگ پر پڑے ہیں، دنیا سے جانے والے ہیں، رخصتی کا منظر ہے، اس وقت بیوی سے کہتے ہیں کہ مہر معاف کردو۔ اب اس موقع پر بیوی کیا کرے؟ کیا رخصت ہونے والے شوہر

(۱) سنن الترمذی ۲/۴۵۴ (۱۱۶۲) وقال هذا حديث حسن صحيح۔ ومسند احمد ۱۶/۱۱۴ (۱۰۱۰۶)۔

(۲) صحيح البخاری ۷/۲۶ (۵۱۸۶) وصحيح مسلم ۲/۱۰۹۱ (۱۴۶۸)۔

سے یہ کہہ دے کہ میں معاف نہیں کرتی، چنانچہ اس کو مہر معاف کرنا پڑتا ہے۔ ساری عمر اس سے فائدہ اٹھایا، ساری عمر تو اس سے حقوق طلب کیے، لیکن اس کا حق دینے کا وقت آیا تو اس میں ڈنڈی مار گئے۔ یہ تو مہر کی بات تھی۔

نفقہ میں کمی حق تلفی ہے

نفقہ کے اندر شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کو اتنا نفقہ دیا جائے کہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ گزارہ کر سکے، اگر اس میں کمی کرے گا تو یہ بھی کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے اور حرام ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس کا کوئی حق دوسرے کے ذمے واجب ہو وہ اس کو پورا ادا کرے، اس میں کمی نہ کرے، ورنہ اس عذاب کا مستحق ہوگا، جس عذاب کی وعید اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمائی ہے۔

یہ ہمارے گناہوں کا وبال ہے

ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ہم مجلس جما کر بیٹھتے ہیں تو حالات پر تبصرہ کرتے ہیں کہ بہت حالات خراب ہو رہے ہیں، بدامنی ہے، بے چینی ہے، ڈاکے پڑ رہے ہیں، جان محفوظ نہیں، مال محفوظ نہیں، معاشرہ بدحالی کے اندر مبتلا ہیں، یہ سب تبصرے ہوتے ہیں، لیکن کوئی شخص ان تمام پریشانیوں کا حل تلاش کر کے اس کا علاج کرنے کو تیار نہیں ہوتا، مجلس کے بعد دامن جھاڑ کر اٹھ جاتے ہیں۔

ارے! دیکھو کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خود سے نہیں ہو رہا، بلکہ کوئی کرنے والا کر رہا ہے، اس کائنات کا کوئی ذرہ اور کوئی پتّا اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، لہٰذا اگر بدامنی اور بے چینی آ رہی ہے تو اس کی مشیت سے

آرہی ہے، اگر سیاسی بحران پیدا ہو رہا ہے تو وہ بھی اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اگر چوریاں ڈکیتیاں ہو رہی ہیں تو اسی کی مشیت سے ہو رہی ہیں، یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (۱)

یعنی جو کچھ تمہیں برائی یا مصیبت پہنچ رہی ہے وہ سب تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں۔

دوسری جگہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۲)

یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ہر گناہ پر پکڑنے پر آجائیں تو روئے زمین پر کوئی چلنے والا جانور باقی نہ رہے، سب ہلاک و برباد ہوجائیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے اور اپنی رحمت سے بہت سے گناہ معاف کرتے رہتے ہیں، لیکن جب تم حد سے بڑھ جاتے ہو اس وقت اس دنیا کے اندر بھی تم پر عذاب نازل کیے جاتے ہیں، تاکہ تم سنبھل جاؤ، اگر اب بھی سنبھل گئے تو تمہاری باقی زندگی بھی درست ہوجائے گی اور آخرت بھی درست ہوجائے گی، لیکن اگر اب بھی نہ

---

(۱) سورۃ الشوریٰ آیت (۳۰)۔
(۲) سورۃ فاطر آیت (۴۵)۔

سنبھلے تو یاد رکھو! دنیا کے اندر تو تم پر عذاب آ ہی رہا ہے، اللہ بچائے آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حرام کے پیسوں کا نتیجہ

آج ہر شخص فکر میں ہے کہ کسی طرح دو پیسے جلدی سے ہاتھ آ جائیں، کل کے بجائے آج ہی مل جائیں، چاہے حلال طریقے سے ملیں یا حرام طریقے سے ملیں، دھوکہ دے کر ملیں یا فریب دے کر ملیں یا دوسرے کی جیب کاٹ کر ملیں، لیکن مل جائیں یاد رکھو۔ اس فکر کے نتیجے میں تمہیں دو پیسے مل جائیں گے، یہ دو پیسے دنیا میں کچھ بھی تمہیں امن اور سکون نہیں دے سکتے، یہ دو پیسے تمہیں چین کی زندگی نہیں دے سکتے، اس لیے کہ یہ دو پیسے تم نے حرام طریقے سے اور دوسرے کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر، دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر حاصل کیے ہیں، لہٰذا گنتی میں تو یہ پیسے شاید اضافہ کر دیں، لیکن تمہیں چین لینے نہیں دیں گے اور کوئی دوسرا شخص تمہاری جیب پر ڈاکہ ڈال دے گا اور اس سے زیادہ نکال کر لے جائے گا۔ آج بازاروں میں یہی ہو رہا ہے کہ آپ نے ملاوٹ کر کے دھوکہ دے کر پیسے کمائے، دوسری طرف دو مسلح افراد آپ کی دوکان میں داخل ہوئے اور اسلحے کے زور پر آپ کا سارا اثاثہ اٹھا کر لے گئے۔ اب بتایئے! جو پیسے آپ نے حرام طریقے سے کمائے تھے، وہ فائدہ مند ثابت ہوئے یا نقصان دہ؟ لیکن اگر تم حرام طریقہ اختیار نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھتے تو اس صورت میں یہ پیسے اگرچہ گنتی میں کچھ کم ہوتے، لیکن تمہارے لیے آرام اور سکون اور چین کا ذریعہ بنتے۔

عذاب کا سبب گناہ ہیں

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بہت امانت اور دیانت کے ساتھ پیسے کمائے تھے، اس کے باوجود ہماری دکان پر ڈاکو آگئے اور لوٹ کر لے گئے، بات یہ ہے کہ ذرا غور کرو کہ اگرچہ تم نے امانت اور دیانت سے کمائے تھے، لیکن یقین کرو تم سے کوئی نہ کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ یہی فرمارہے ہیں کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچ رہی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ تم نے کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اس کا خیال اور دھیان نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ تم نے زکوۃ پوری ادا نہ کی ہو یا زکوٰۃ کا حساب صحیح نہ کیا ہو یا اور کوئی گناہ کیا ہو، اس کے نتیجے میں یہ عذاب تم پر آیا ہو۔

یہ عذاب سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا

دوسرے یہ کہ جب کوئی گناہ معاشرے میں پھیل جاتا ہے اور اس گناہ سے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہوتا تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو عذاب یہ نہیں دیکھتا کہ کس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور کس نے نہیں کیا تھا، بلکہ وہ عذاب عام ہوتا ہے تمام لوگ اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً [1]

یعنی اس عذاب سے ڈرو جو صرف ظالموں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا، بلکہ جو لوگ ظلم سے علیحدہ تھے وہ بھی اس عذاب میں پکڑے جائیں گے۔ اس

---

(۱) سورۃ الانفال آیت (۲۵)۔

لیے کہ اگرچہ یہ لوگ خود ظالم نہیں تھے، لیکن کبھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ظلم کو مٹانے کی جدوجہد نہیں کی، اس ظلم کے خلاف ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس لیے گویا وہ بھی اس ظلم میں ان کے ساتھ شامل ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ ہم تو بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ تجارت کر رہے تھے اس کے باوجود ہمارے ہاں چوری ہوگئی اور ڈاکہ پڑ گیا اتنی بات کہہ دینا کافی نہیں۔ اس لیے کہ اس امانت اور دیانت کو جو دوسروں تک پہنچانے کا کام تم نے انجام نہیں دیا، اس کو چھوڑ دیا اس لیے اس عذاب میں تم بھی گرفتار ہوگئے۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کا یہ شیوہ تھا کہ تجارت بالکل صاف ستھری ہو، اس میں دیانت اور امانت ہو، دھوکہ اور فریب نہ ہو۔ آج مسلمانوں نے تو ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور انگریزوں اور امریکیوں اور دوسری مغربی اقوام نے ان چیزوں کو اپنی تجارت میں اختیار کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت کو فروغ ہو رہا ہے، دنیا پر چھا گئے ہیں، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یاد رکھو! باطل کے اندر کبھی ابھرنے اور ترقی کرنے کی طاقت ہی نہیں، اس لیے کہ قرآنِ کریم کا صاف ارشاد ہے:

اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا [1]

یعنی باطل تو مٹنے کے لیے آیا ہے، لیکن اگر کبھی تمہیں یہ نظر آئے کہ کوئی باطل ترقی کر رہا ہے، ابھر رہا ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی

(۱) سورۃ الاسراء آیت (۸۱)۔

ہے اور اس حق چیز نے اس کو ابھار دیا ہے، لہٰذا باطل لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ان کو دنیا کے اندر بھی ذلیل ورسوا کر دیا جاتا، لیکن کچھ حق چیزیں ان کے ساتھ لگ گئیں، وہ امانت اور دیانت جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی تھی وہ انہوں نے اختیار کرلی۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت کو ترقی عطا فرمائی۔ آج وہ پوری دنیا پر چھا گئے اور ہم نے تھوڑے سے نفع کی خاطر امانت اور دیانت کو چھوڑ دیا اور دھوکہ اور فریب کو اختیار کر لیا اور یہ نہ سوچا کہ یہ دھوکہ اور فریب آگے چل کر ہماری اپنی تجارت کو تباہ وبرباد کردے گی۔

مسلمانوں کا طرہ امتیاز

مسلمان کا ایک طرّہ امتیاز یہ ہے کہ وہ تجارت میں کبھی دھوکہ اور فریب نہیں دیتا، ناپ تول میں کمی نہیں کرتا، کبھی ملاوٹ نہیں کرتا، امانت اور دیانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایسا ہی معاشرہ پیش کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شکل میں ایسے لوگ تیار کیے جنہوں نے تجارت میں بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کر لیا، لیکن دھوکہ اور فریب دینے کو گوارہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت بھی چمکائی اور ان کی سیاست بھی چمکائی، ان کا بول بالا کیا اور انہوں نے دنیا سے اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوایا، آج ہمارا حال یہ ہے کہ عام مسلمان نہیں، بلکہ وہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں، لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں تو سب احکام بھول جاتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف مسجد تک کے لیے ہیں،

بازار کے لیے نہیں، خدا کے لیے اس فرق کو ختم کریں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تمام احکامات کو بجا لائیں۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ "تطفیف" کے اندر وہ تمام صورتیں داخل ہیں جس میں ایک شخص اپنا حق تو پورا پورا وصول کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے، لیکن اپنے ذمے جو دوسروں کے حقوق واجب ہیں وہ اس کو ادا نہ کرے۔ ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا يؤمن أحدكم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه"(۱)

"یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

یہ نہ ہو کہ اپنے لیے تو پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسروں کے لیے پیمانہ کچھ اور ہے، جب تم دوسروں کے ساتھ کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ سوچو کہ اگر یہی معاملہ کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ کرتا تو مجھے ناگوار ہوتا، میں اس کو اپنے اوپر ظلم تصور کرتا، تو اگر میں بھی یہ معاملہ جب دوسروں کے ساتھ کروں گا تو وہ بھی آخر انسان ہے، اس کو بھی اس سے ناگواری اور پریشانی ہوگی، اس پر ظلم ہوگا، اس

(۱) صحیح البخاری ۱۲/۱ (۱۳) و صحیح مسلم ۶۷/۱ (۴۵)۔

لیے مجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔

لہٰذا ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا جائزہ لیں کہ کہاں کہاں ہم سے حق تلفیاں ہو رہی ہیں، کم ناپنا، کم تولنا، دھوکہ دینا، ملاوٹ کرنا، فریب دینا، عیب دار چیز فروخت کرنا، یہ تجارت کے اندر حرام ہے۔ جس کی وجہ سے تجارت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وبال آرہا ہے، یہ سب حق تلفی اور ''تطفیف'' کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی حقیقت کا فہم اور ادراک عطا فرمائے اور حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ''تطفیف'' کے وبال اور عذاب سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین
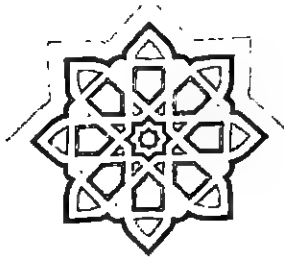
دوہرے پیمانے

(ذکر و فکر ص ۹۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دوہرے پیمانے

قرآنِ کریم نے ناپ تول میں کمی کرنے کو جرم عظیم قرار دے کر جس طرح صحیح صحیح ناپنے اور تولنے کا حکم دیا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ حکم ایک جگہ بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ اسے بار بار مختلف انداز و اسلوب سے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات کریمہ کا پورا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

''اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپو اور تولو''

(سورۃ انعام: ۱۵۲)

''پس پورا پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو'' (سورۃ الاعراف: ۸۵)

''اور ناپ تول میں کمی نہ کرو'' (سورہ ہود: ۸۴)

''اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا رکھو''

(سورہ ہود: ۸۵)

''جب کوئی چیز ناپ کر دو تو پورا پورا ناپو اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (سورہ بنی اسرائیل: ۳۵)

''پورا پورا ناپو اور دوسروں کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو اور ٹھیک ٹھیک ترازو سے تولو'' (سورۃ الشعراء: ۱۸۱)

''اور اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو بنائی، تاکہ تم تولنے میں حد سے تجاوز نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں'' (سورۃ الرحمن: ۷)

قرآنِ کریم نے جس صراحت اور جس تاکید کے ساتھ بار بار ناپ تول میں انصاف سے کام لینے پر زور دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناپ تول میں بے انصافی قرآنِ کریم کے نزدیک ان بنیادی بیماریوں میں سے ہے جو معاشرتی خرابیوں کی جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جنہیں مٹانے کے لیے انبیاءِ کرام علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ناپ تول میں کمی کا مطلب صرف یہ ہے کہ ترازو سے تول کر یا پیمانے سے ناپ کر کوئی چیز بیچ رہا ہو وہ ڈنڈی مار کر سودا کم دے؟ یقیناً ناپ تول میں کمی کرنے کا براہ راست مفہوم یہی ہے، لیکن جس اسلوب و انداز سے قرآنِ کریم نے اس برائی کا ذکر فرمایا ہے، اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ برائی صرف اسی ایک صورت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر وہ اقدام شامل ہے جس کے ذریعے کوئی شخص دوسرے کا کسی بھی قسم کا حق پامال کر دے یا انصاف کے مطابق اس کا حق پورا پورا نہ دے۔

دراصل قرآنِ کریم نے ''ترازو'' کا لفظ عدل و انصاف اور ایفائے حقوق کی

ایک علامت (Symbol) کے طور پر استعمال فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۂ شوریٰ اور سورۂ حدید میں ''ترازو'' کو ''آسمانی کتاب'' کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے، سورۂ شوریٰ میں ہے:

> ''اللہ وہ ہے جس نے حق پر مشتمل کتاب اتاری اور ترازو (نازل کی)۔'' (سورۃ الشوریٰ: ۱۷)

اور سورۂ حدید میں اسی بات کو مزید واضح فرمایا گیا:

> ''اور ہم نے ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاردی تاکہ لوگ انصاف کریں۔'' (سورہ الحدید: ۲۵)

اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی پیغمبر اپنے ہاتھ میں ترازو لے کر نہیں آئے، جس سے سودا تولا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں ''ترازو'' کا واضح مطلب عدل وانصاف اور ''ادائے حقوق'' کی معنوی ترازو ہے اور ''کتاب'' کے ساتھ ملا کر ترازو کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر آسمانی کتاب نظریاتی ہدایت فراہم کرتی ہے تو پیغمبر کا قول وفعل لوگوں کے سامنے وہ جچا تلا پیمانہ پیش کرتا ہے جو حق اور ناحق کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے، جس کی روشنی میں حقوق کی رتی رتی کا حساب رکھا جاسکتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ناپ تول میں کمی کا لفظ ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے، جس میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، جب بھی کوئی شخص دوسرے کا کوئی حق ٹھیک ادا نہ کرے تو وہ ''ناپ تول'' میں کمی کا مرتکب ہے اور اس کا یہ فعل اتنا ہی قابلِ نفرت و ملامت ہے جتنا سودا بیچتے وقت ڈنڈی مارنے کا عمل، جسے ہر شخص ذلالت اور کمینگی کی علامت سمجھتا ہے۔ لہٰذا ''ناپ تول'' کے

سلسلے میں قرآنِ کریم کے جو ارشادات اوپر بیان کیے گئے ہیں ان کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جس کے ذمے دوسرے کا حق ہو، شوہر کے لیے ان ارشادات کا مطلب یہ ہے کہ ''بیوی کا حق پورا پورا ادا کرو'' اور بیوی کے لیے ان کا مطلب یہ ہے کہ ''شوہر کا حق پورا پورا ادا کرو'' حکومت کے لیے ان کا مطلب یہ ہے کہ ''عوام کا حق پورا پورا دو'' اور عوام کے لیے ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ''حکومت کا حق پورا پورا ادا کرو'' ملازم کے لیے ان ارشادات میں یہ ہدایت ہے کہ انتظامیہ کی طرف سے جو فرائض تمہارے سپرد کیے گئے ہیں اور جن کے معاوضے میں تمہیں تنخواہ یا اجرت دی جارہی ہے، وہ ٹھیک ٹھیک دیانت داری کے ساتھ بجالاؤ اور انتظامیہ کے لیے ان ارشادات میں یہ تاکید ہے کہ ''ملازم کے وہ تمام حقوق اسے پورے پورے پہنچاؤ جن کے معاوضے میں تم اس کی محنت سے استفادہ کر رہے ہو''، غرض دنیا میں دوطرفہ تعلقات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے لیے ان آیاتِ کریمہ میں جامع رہنمائی موجود نہ ہو۔

پھر قرآنِ کریم ہی نے مزید آگے بڑھ کر یہ بھی واضح کیا ہے کہ ''ناپ تول میں کمی'' کی بدترین شکل یہ ہے کہ انسان اپنے اور دوسرے کے لیے الگ الگ پیمانے بنالے، یعنی جب کسی کو دینے کا وقت آئے تو ناپ تول میں ڈنڈی مارجائے، لیکن جب خود اپنا حق وصول کرنے کا وقت آئے تو ایک رتی چھوڑنے کو تیار نہ ہو، ایسے لوگوں کے لیے قرآنِ کریم نے انتہائی موثر انداز میں یہ وعید بیان فرمائی ہے کہ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③ اَلَا

برا ہو ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کو ذرا خیال نہیں کہ وہ ایک زبردست دن میں اٹھائے جائیں گے اس دن جب تمام انسان رب العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے؟

یہاں پھر اگرچہ لفظ ''ناپ تول'' میں کمی کا استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کے وسیع مفہوم میں ہر قسم کی حق تلفی داخل ہے، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

''پورا تولنا اور کم تولنا ہر کام میں ہوسکتا ہے''۔
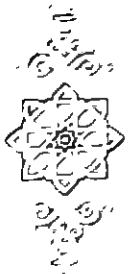
لہٰذا اس آیت میں اصولی مذمت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جنہوں نے زندگی کے معاملات میں دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، جن کے لینے کا پیمانہ کچھ اور ہے اور دینے کا کچھ اور، جو اپنا مفاد حاصل کرنے میں بڑے تیز طرّار اور دوسرے کا حق دینے میں بڑے بخیل اور خسیس ہیں اور جو دن رات عدل و انصاف کا خون کرکے اپنی دولت کی گنتی میں اضافہ کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ذرا پروا نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کے وقت دولت کا یہ ظاہری

(۱) سورۃ المطففین آیت (۱ تا ٦)۔

اضافہ ان کے لیے ذلت و رسوائی اور کس طرح کے عذاب کا سبب بنے گا؟

مقامِ حسرت یہ ہے کہ آج ہم نے حقوق و فرائض کی ناپ تول میں اللہ کی اتاری ہوئی ترازو کے بجائے زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ان خود ساختہ دوہرے پیمانوں کو اختیار کیا ہوا ہے اور اپنے آپ کو قرآنِ کریم کی اس سنگین وعید کا مستحق بنا رکھا ہے۔

اگر ایک آجر اپنے مزدور سے اس کی آزاد مرضی کے بغیر مقررہ وقت سے زیادہ کام لیتا ہے اور اس اضافی محنت کا معاوضہ دینے کو تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے اس ''دوہرے پیمانے'' کی وجہ سے قرآنِ کریم کی اس وعید میں داخل ہے اور اس طرح اس نے مزدور سے زائد خدمت لے کر جو فائدہ حاصل کیا ہے وہ اس کے لیے حرام ہے۔

اسی طرح اگر ایک مزدور یا ملازم اپنی ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں اپنے فرائض انجام دینے کے بجائے کام چوری کا مظاہرہ کرتا ہے یا اس وقت میں اپنا ذاتی کام انجام دیتا ہے اور تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی اس قرآنی وعید کا مصداق ہے اور اس کی تنخواہ کا وہ حصہ حرام ہے جو ذاتی کام میں خرچ کیے ہوئے وقت کے مقابل ہو، یہاں تک کہ ایک ملازم کے لیے اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں جبکہ اس کے پاس اپنی ڈیوٹی سے متعلق کرنے کا کام موجود ہو، کوئی نفلی عبادات، مثلاً نفلی نماز یا تلاوت وغیرہ بھی جائز نہیں، اس کے ذمے اس وقت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی تندہی اور دیانت سے ادا کرے۔

یہ بات قلم پر آئی تو یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ اس معاملے میں بھی ہمارے یہاں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ بعض ملازمین ڈیوٹی کے اوقات میں

نفلی عبادتیں شروع کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے ذمے کام پڑا ہوا ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف انتظامیہ کے بعض افراد اپنے ملازمین کو پانچ وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کا موقع نہیں دیتے، حالانکہ فرض نماز کی ادائیگی بہرصورت ضروری ہے اور انتظامیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملازمین کے لیے اس کا انتظام کرے۔ یہ درست ہے کہ ملازم آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا پابند ہے، لیکن طبعی ضروریات کی انجام دہی، خود بخود اس مدت سے مستثنیٰ ہے، فرض نماز بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسان کی طبعی ضروریات، لہٰذا اس کی ادائیگی کا وقت بھی ڈیوٹی سے خود بخود مستثنیٰ ہوگا، البتہ ملازم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعتدال کے ساتھ نماز فرض (سنتوں سمیت) ادا کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں ناواجبی دیر نہ لگائے، نہ کسی اور نفلی عبادت میں مشغول ہو۔
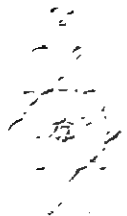
یہ بات تو ضمنی طور پر بیچ میں آگئی، کہنا یہ تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے حالات کا جائزہ لے کر یہ دیکھنا چاہیے کہ دوسرے کے حق میں کوتاہی کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟ ہم نے اپنے اور دوسروں کے لیے الگ الگ پیمانے تو نہیں بنا رکھے؟ ہم دوسروں سے اس چیز کا مطالبہ تو نہیں کر رہے جو ان کی جگہ ہونے کی صورت میں انہیں دینے کے لیے تیار نہ ہوتے؟ جب تک یہ فکر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوگی اور ہم قرآنِ کریم کی اس وعید میں داخل ہونے سے ڈرنے نہیں لگیں گے، اس وقت تک ان حق تلفیوں اور بدعنوانیوں میں کمی نہیں آئے گی، جنہوں نے زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے اور جن کی وجہ سے ہر انسان خوف و ہراس، تشویش اور بے چینی کا شکار ہے، کیونکہ جب معاشرے میں حق تلفیوں کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ (Net Result) سب کی پریشانی کے سوا کچھ

نہیں ہوتا۔ ایک شخص اگر دس آدمیوں کی حق تلفی کرتا ہے تو دوسرے دس آدمی اس کا حق اڑا لے جاتے ہیں اور آخر میں فتح صرف شیطان کی ہوتی ہے۔

۲۶/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
۸/ مئی ۱۹۹۴ء
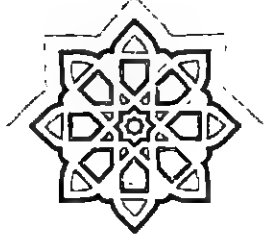
حرام مال سے بچاؤ

(نشری تقریریں ۱۰۹)

حرام مال سے بچاؤ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾(1)

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمے) کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ کہ اس کے ذریعے لوگوں کے مال کا کوئی حصہ گناہ کے طریقے پر کھا جاؤ، جبکہ تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو۔

(1) سورۃ البقرۃ آیت (۱۸۸)۔

قرآنِ کریم کی اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت بڑے جامع انداز میں کی گئی ہے۔ یوں تو ہر قوم اور ہر مذہب وملت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مال حاصل کرنے کے کچھ طریقے پسندیدہ اور جائز ہیں اور کچھ ناپسندیدہ اور ممنوع، مثلاً چوری، ڈاکہ، دھوکہ فریب کو ساری دنیا ہی برا سمجھتی ہے، لیکن ان ذرائع کے جائز یا ناجائز ہونے کا کوئی ایسا معیار نہ کسی قوم کے پاس ہے اور نہ ہوسکتا ہے جو پوری دنیا کے لیے معقول اور قابلِ قبول ہو۔ اس کا صحیح اور معقول معیار صرف وہی ہوسکتا ہے جو رب العالمین کی طرف سے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہو، کیونکہ خالقِ کائنات ہی اپنے بندوں کی حقیقی مصلحتوں سے باخبر ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اسلام نے حلال وحرام اور جائز وناجائز کا جو قانون بنایا ہے وہ صراحۃً وحی الٰہی سے ماخوذ یا مستفاد ہے، اس قانون میں ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی جدوجہد کے مطابق ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور کوئی انسان دوسروں کے حقوق غصب کرکے یا دوسروں کو نقصان پہنچا کر سرمایے کو محدود افراد میں مقید نہ کردے، بلکہ جو بھی ملکیت کسی کو حاصل ہو وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو، آیت مذکورہ ان تمام ناجائز صورتوں کو شامل ہے، اس میں سود، قمار، رشوت خوری، ملاوٹ، دھوکہ فریب، جھوٹے مقدمات غرض ان تمام ناجائز ذرائع آمدنی کو شامل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

یعنی نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر۔

اس میں ایک بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے اَمْوَالَكُمْ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ''نہ کھاؤ اپنے مال'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم جو کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ دوسرے شخص کو بھی اپنے مال سے ایسی ہی محبت ہوگی جیسی تمہیں اپنے مال سے ہے، اگر وہ تمہارے مال میں ایسا ناجائز تصرف کرتا تو تمہیں جو دکھ پہنچتا ایسا ہی دکھ دوسرے کو بھی پہنچے گا، اس بات کا احساس اس وقت بھی اس طرح کرو جیسے کہ وہ تمہارا مال ہے۔

اس کے علاوہ آیت کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتا ہے اور یہ رسم چل پڑتی ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے مال میں ایسا ہی ناجائز تصرف کرتے ہیں، اس حیثیت سے کسی شخص کے مال میں ناجائز تصرف در حقیقت اپنے مال میں ناجائز تصرف کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے، غور کیجیے کہ جب اشیاءِ ضرورت میں ملاوٹ کی رسم چل جائے تو ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص گھی میں تیل یا چربی ملا کر زائد پیسے حاصل کرتا ہے، لیکن جب اس کو دودھ خریدنے کی ضرورت پڑتی ہے تو دودھ والا اس میں پانی ملا کر دیتا ہے، مسالے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس میں ملاوٹ ملتی ہے، دوا لینے جاتا ہے تو وہاں کھوٹ ملتا ہے۔ اس طرح جتنے زائد پیسے اس نے ایک جگہ ملاوٹ کر کے حاصل کیے دوسرے افراد دسیوں جگہ اس کی جیب سے نکال لیتے ہیں۔ یہ بے چارہ اپنی جگہ پیسوں کی زیادتی شمار کر کے خوش ہوتا ہے مگر انجام نہیں دیکھتا کہ اس کے پاس کیا رہا؟ اور حقیقت میں جو کوئی شخص دوسرے کا مال غلط طریقے سے حاصل کرتا ہے

در حقیقت وہ خود اپنے مال کے ناجائز تصرف کا دروازہ کھولتا ہے۔

یوں تو یہ ناجائز ذرائع آمدنی ہر وقت اور ہر زمانے میں ناجائز ہیں، لیکن کسی مقدس زمانے میں یا مقدس مقام پر ان کا ارتکاب کیا جائے تو ان کی قباحت اور بڑھ جاتی ہے، خاص طور سے رمضان کے مبارک مہینے میں، کیونکہ اس مہینے میں ایک مسلمان اللہ کے حکم کی خاطر جائز اور مباح چیزوں (مثلاً کھانے پینے) کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ بات بڑی شرم کی ہے کہ جو چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں انہیں ترک نہ کرے، لہٰذا اس مبارک مہینے میں اکلِ حلال کا زیادہ اہتمام لازمی ہے۔

حرام سے بچنے اور حلال حاصل کرنے کے لیے قرآن وسنت میں مختلف عنوانات سے تاکیدیں کی گئی ہیں، ایک آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کے اعمال واخلاق میں بہت بڑا دخل کھانے کو ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں تو اس سے اچھے اعمال واخلاق کی توقع مشکل ہے، ارشاد ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ط (1)

اے گروہ انبیاء! حلال اور پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، میں تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہوں۔

اس آیت میں حلال کھانے کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا حکم فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ اعمالِ صالحہ کا صدور اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ انسان کا کھانا پینا حلال ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ حرام کھانے والے کی

(1) سورۃ المومنون آیت (۵۱)۔

دعا قبول نہیں ہوتی، فرمایا کہ بہت سے آدمی عبادت وغیرہ میں مشقت اٹھاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ دعا کے لیے پھیلاتے ہیں اور یا رب یارب پکارتے ہیں مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام تو ان کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟[1] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے لیے یہ دعا فرمادیجیے کہ میری ہر دعا قبول ہوا کرے، آپ نے فرمایا:

> اے سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنا لو، تمہاری دعائیں قبول ہونے لگیں گی اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو اس گوشت کے لیے تو جہنم کی آگ ہی زیادہ لائق ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام مال سے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے محفوظ رکھے اور رزقِ حلال کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

---

(۱) صحیح مسلم ۷۰۳/۲ (۱۰۱۵)۔

(۲) المعجم الاوسط للطبرانی ۳۱۰/۶ (٦٤٩٥) طبع دار الحرمین القاهرة۔ وقال الهيثمي في "المجمع" ۵۲۱/۱۰ (۱۸۱۰۱): وفيه من لم أعرفهم.

حرام مال سے بچیں
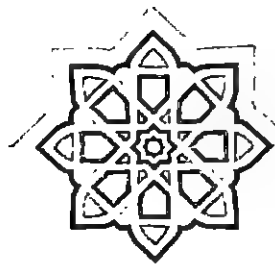
اور

ہمیشہ سچ بولیں

(اسلام اور ہماری زندگی ۳/ ۱۶۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرام مال سے بچیں اور ہمیشہ سچ بولیں

بعد از خطبہ مسنونہ!

أما بعد!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عن عبد الله بن عمرو أن رسول الله ﷺ قال: «أربع إذا كن فيك فلا عليك ما فاتك من الدنيا: حفظ أمانة، وصدق حديث، وحسن خليقة، وعفة في طعمة». [1]

---

(۱) الزهد لابن المبارک ۱/۴۲۴ (۱۲۰۴) طبع دار الکتب العلمیة۔ مسند احمد ۱۱/۲۳۳ (۶۶۵۲) وقال الهيثمي في "مجمع الزوائد" ۴/۲۵۷ (۶۷۰۶): رواه أحمد والطبراني في "الكبير"، وفيه ابن لهيعة، وحديثه حسن، وبقية رجال أحمد رجال الصحيح. وقال في ۱۰/۵۲۹ (۱۸۱۲۳): رواه أحمد والطبراني، وإسنادهما حسن.

''حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص میں یہ چار صفات موجود ہوں اسے دنیا کی کسی چیز کی محرومی نقصان نہیں پہنچا سکتی، ① امانت کی حفاظت، ② بات کی سچائی، ③ اچھے اخلاق اور ④ حلال کھانا''۔

یہ چار خصلتیں جو بیان فرمائیں کہ اگر عطا ہو جائیں تو دنیا کی کوئی اور نعمت نہ ملے تب بھی تمہاری بھلائی کے لیے یہ چار چیزیں کافی ہیں۔

ان میں سے پہلی چیز یعنی حسن اخلاق اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔ دوسری چیز جو بیان فرمائی گئی وہ ہے لقمے کی پاکیزگی، آدمی جو کچھ کھا رہا ہے جو رزق اس کو ملا ہوا ہے وہ پاکیزہ ہو۔

مال کی پاکیزگی سے کیا مراد ہے؟

پاکیزہ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض دیکھنے میں صاف ستھرا ہو، جراثیم سے پاک ہو، یہ چیز تو ہونی ہی چاہیے کہ انسان صاف ستھرا کھانا کھائے، لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ وہ حلال ہو ناجائز اور حرام کھانے سے انسان پرہیز کرے اور رزق حلال کو حاصل کرنا اور اپنے رزق میں حلال ہونے کا اہتمام کرنا یہ ایمان کے بنیادی ستونوں میں سے ہے کہ آدمی اس بات کا پورا لحاظ رکھے کہ جو لقمہ میں کھا رہا ہوں وہ حلال لقمہ ہو، کیونکہ حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”إنه لا يربو لحم نبت من سحت إلا كانت النار أولى به“(۱)

”انسان کے جسم پر جو گوشت حرام کھا کر بنا ہوگا وہ جہنم کا ایندھن ہے“۔

ظاہر ہے کہ انسان جب حرام کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی بڑھوتری ہوتی ہے، نشو ونما ہوتی ہے، اسی سے گوشت بنے گا، جسم کے دوسرے اعضاء بنیں گے، اس سے جسم کے اندر قوت آئے گی، تو جو کوئی گوشت حرام مال سے اور حرام کھانے سے بنا ہوگا تو جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے، وہ جہنم کا ایندھن بنے گا، اس واسطے ہر مومن کو اس بات کا اہتمام لازم ہے کہ جو کچھ وہ کھا رہا ہے اس کے حلال ہونے کا پورا اطمینان حاصل ہو کہ کوئی حرام چیز اپنے حلق سے پیٹ میں نہ جائے۔

حرام مال کی دنیاوی بے برکتی

حرام رزق کا جو وبال آخرت میں ہے وہ تو ہے، جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ گوشت جہنم کا ایندھن بنے گا، لیکن اس دنیا میں بھی حرام کی بے برکتی اللہ تبارک وتعالیٰ دکھا دیتے ہیں، حرام طریقے سے کمایا ہوا پیسہ اور حرام کھانا دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو ایک عذاب بنا دیتے ہیں۔ بظاہر انسان کے پاس پیسے بہت اکٹھے ہو گئے، بینک بیلنس بہت ہو گیا، لیکن مصیبتیں آرہی ہیں، آفتیں آرہی ہیں، کبھی چوریاں ہو رہی ہیں، کبھی ڈاکے پڑ رہے ہیں، کبھی کوئی اغوا ہو رہا ہے، کبھی بیماریاں کھڑی ہوگئی ہیں اور کبھی کوئی پریشانیاں کھڑی

(۱) سنن الترمذی ۶۰۱/۱ (۶۱۴) وقال ہذا حدیث حسن غریب من ہذا الوجہ۔

ہورہی ہیں، تو یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہورہی ہیں حرام رزق سے اور حرام مال سے۔

تو ایک نقصان دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ انسان کے مال میں برکت نہیں ہوتی، پیسے گنتی میں تو بہت ہوگئے، لیکن برکت نہیں۔ آج کل اچھے بڑے کھاتے پیتے لوگ جن کی آمدنیاں بہت ہیں مگر یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ پورا نہیں ہوتا، پورا اس لیے نہیں ہوتا کہ اس بات کا دھیان نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق رزق حاصل ہو، اس کے خلاف جو حاصل ہوگا وہ تو پورا نہیں ہوگا، اس میں تو برکت نہیں ہوگی۔

حرام مال کا سب سے بڑا نقصان

دوسری اس سے بھی خطرناک بے برکتی یہ ہے کہ حرام گوشت، حرام کھانا، حرام رزق انسان کے اندر سے ایمان کی حِس سلب کرلیتا ہے۔ اللہ بچائے ایمان کا جو شعور ہے جو حس ہے وہ چھن جاتی ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، عقل خراب ہوجاتی ہے، عقل الٹی ہوجاتی ہے، برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اچھے کو برا سمجھنے لگتا ہے اور اس کا احساس ان حضرات کو ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کا شعور اور نور عطا فرمایا، ان کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم سے کیا چیز چھن گئی، اگر حرام کا ذرا سا بھی غبار آجائے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ دل کے اندر ایک تاریکی اور ظلمت چھا گئی، اندھیرا چھا گیا۔

مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کے استاد تھے، ان کا واقعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

وہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھالیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے، فرماتے ہیں کہ مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے اور طبیعت میں یہ داعیہ پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کر لوں، فلاں گناہ کرلوں، حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہوجاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں بہترین انداز میں فرمایا:

يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط [1]

''اے رسولو! پاکیزہ اور حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو''

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب انسان حلال کھانے کا اہتمام کرتا ہے تو اس میں نیک کام کرنے کے جذبے اور شوق پیدا ہوتے ہیں اور اگر حرام رزق کھا رہا ہے تو اس سے انسان کے دل میں برائیوں کے اور گناہ کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ایک کام کو برا سمجھ رہے ہیں کہ یہ کام اچھا نہیں ہے پھر بھی چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، حوصلہ نہیں ہوتا، وہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اپنے رزق اور لقمے کو حلال کرنے کی فکر نہیں، اور نہ جانے کن کن طریقوں سے ناجائز رزق منہ میں جاتا ہے اور پیٹ میں جاتا ہے تو وہ گناہ کے تقاضے پیدا کرتا ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کنکشن رکھا ہے رزقِ حلال اور نیکیوں میں اور رزقِ حرام اور گناہوں میں، جب

---

(۱) سورۃ المومنون آیت (۵۱)۔

رابطہ جوڑ لیا رزقِ حرام سے تو گویا گناہوں سے رابطہ جوڑ لیا، گناہوں کے ساتھ رشتہ لگ گیا گناہ کے تقاضے پیدا ہوگئے، چھوڑنا آسان نہیں رہتا۔

تو دنیا کے اندر رزق حرام کے جو نقصانات ہیں ان میں تو ایک ہے بے برکتی، روپیہ تو بہت جمع ہوگیا، لیکن کام پورے نہیں ہو رہے اور دوسرا خطرناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ظلمت اور تاریکی آتی ہے اور ظلمت کا احساس شروع میں ہوتا ہے ان لوگوں کو جن کے دل پاک صاف ہوتے ہیں، ذرا سی بھی ظلمت آگئی، تاریکی آگئی پتہ چلتا ہے، لیکن اللہ بچائے جب حس مٹ جائے، بے حس ہوجائے تو اس ظلمت کا، تاریکی کا پتہ ہی نہیں چلتا، آدمی کے گناہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اسے احساس ہی نہیں ہوتا۔

حرام مال بے حسی پیدا کرتا ہے

صاحبِ ایمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر کبھی صاحبِ ایمان سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے، انسان ہے کبھی گناہ ہوگیا تو اس کے دل میں اتنی ندامت ہوتی ہے شرمندگی ہوتی ہے کہ اس کو وہ اپنا کیا ہوا گناہ ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور ندامت و شرمندگی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، لیکن جب بے حسی پیدا ہوجائے، غفلت پیدا ہوجائے تو اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ گناہ کرتا ہے، دل میں یہ خیال آیا کہ بھائی تم نے یہ گناہ کا کام کیا فوراً اس خیال کو جھٹک دیا، جیسے ایک مکھی ناک پر آکر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا، تو پھر رفتہ رفتہ بے پرواہ ہوجاتا ہے، غافل ہوجاتا ہے اور گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور ذرا سا بھی احساس باقی نہیں رہتا۔

حرام کھانے والے کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں

تیسرا نقصان حرام رزق کا نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ جب آدمی کا رزق حلال نہ ہو تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے بال پراگندہ اور جسم غبار آلود اور بڑی لجاجت سے اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں کہ یا اللہ یہ کام کردیجیے یا رب یہ کام کردیجیے، لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان کھانا حرام کا ہے، ان کا لباس حرام کا اور ان کا جسم حرام روپے سے پرورش پایا ہوا تو بتاؤ ایسے لوگوں کی دعا کیسے قبول ہو؟''(۱)

تو تیسرا نقصان دنیا میں یہ ہے کہ دعائیں مانگ رہا ہے، لیکن قبول نہیں ہورہیں، اب کتنے لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ دعائیں تو بہت کیں، لیکن قبول نہیں ہوتیں کسی بھی طرح، تو بتاؤ قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دھیان نہیں ہے کہ رزق جو کھا رہا ہے اس کے اندر حرام کی آمیزش ہے، تو اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ تو دنیا میں بے برکتی، تاریکی اور گناہوں کا جذبہ پیدا ہونا اور تیسرا دعاؤں کا قبول نہ ہونا دنیا ہی کے اندر یہ انجام ظاہر ہوتے ہیں، آخرت میں جو عذاب ہوگا وہ علیحدہ ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۷۰۳(۱۰۱۵)۔

رزق حرام ہونے کی مختلف صورتیں

رزق کے حرام ہونے کی بھی مختلف صورتیں ہیں، بعض حرام تو ایسے ہیں جو ہر انسان جانتا ہے۔ مثلاً چوری کر کے مال حاصل کرے، ڈاکہ ڈال کے کرے، سود کھائے، جوا کھیلے، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان جانتا ہے کہ حرام ہیں، لیکن بہت سے شعبے ایسے ہیں جن میں ہمیں اندازہ نہیں، خیال نہیں، توجہ نہیں، دھیان نہیں کہ یہ رزق حرام کا آرہا ہے، مگر دھیان اور توجہ نہیں۔

جھوٹ بول کر چیز بیچنا حرام ہے

مثلاً تاجر ہے، تجارت کر رہا ہے، سامان بیچ رہا ہے اور اس میں غلط بیانی کر کے ملاوٹ کی اور غلط قسم کا سامان دھوکہ دے کر بیچ دیا تو دھوکہ دے کر جو سامان بیچا تو اس سے جو پیسے حاصل ہوئے جو آمدنی آئی وہ حرام کی ہوئی، کیونکہ دھوکہ دے کر حاصل کی گئی۔ ایک چیز کسی ملک کی بنی ہوئی نہیں ہے اور آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ یہ فلاں ملک کی بنی ہوئی ہے اور وہ سامان بیچ دیا تو جھوٹ بولا، دھوکہ دیا تو اس کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہوئی حلال نہ ہوئی۔ تو اب جو کھانا کھا رہے ہیں وہ حلال نہیں کھا رہے تو رزق حرام ہوگیا، اس کی طرف بھی دھیان نہیں۔

ملازمت میں کام چوری حرام ہے

مثلاً ایک شخص کسی جگہ ملازم ہے تو جو ڈیوٹی کے اوقات ہیں آٹھ گھنٹے ہیں وہ پورے کے پورے ملازمت کے کام میں صرف کرے۔ اب کوئی آدمی ان

آٹھ گھنٹوں میں سے وقت بچاتا ہے، دیر سے جاتا ہے اور جلدی واپس آجاتا ہے اور بیچ میں اپنے ذاتی کام کر رہا ہے محکمے کے کام کے بجائے یا ملاقات کرنے کے لیے اٹھ کر چلا گیا چاہے نفل پڑھنے کے لیے چلا گیا تو اس کے لیے یہ ناجائز ہے حرام ہے، فرض نماز تو ٹھیک ہے، لیکن نوافل پڑھنے کے لیے یا اگر کوئی تلاوت کرنے کے لیے آ گیا ڈیوٹی کے اوقات میں تو یہ اس کے لیے حرام ہے، اتنی مدت کی جو تنخواہ ہوئی وہ حرام ہے ناجائز ہے۔ جب وہ تنخواہ میں شامل ہوگیا تو آپ کو پتہ ہے اگر ایک بالٹی رکھی ہوئی ہو پانی کی اور اس میں ایک قطرہ پیشاب کا ڈال دیا جائے تو وہ ہے تو ایک چھوٹا سا قطرہ، لیکن پوری بالٹی کو گندا کرے گا کہ نہیں؟ پوری بالٹی کو ناپاک بنادے گا۔ تو یہ حرام مال چاہے تھوڑا سا ہی ہو، لیکن جب انسان کے رزق میں شامل ہوگیا تو اس نے حرام ہونے کی نجاست پھیلادی اور نجاست کے پھیلانے کے نتیجے میں انسان جو رزق کھا رہا ہے وہ حرام ہوگیا اور حرام کی بے برکتی شامل ہوگئی۔

اب دیکھیں کہ ہم لوگ کتنے اس میں مبتلا ہیں کہ نوکری کی ہوئی ہے اور نوکری کے اندر وقت پورا نہیں دیتے، اپنے ذمے جو فرائض ہیں ان کو پوری طرح ادا نہیں کرتے، تو وہ جو تنخواہ مل رہی ہے وہ تنخواہ حلال نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، لیکن کتنے مسلمان اس میں مبتلا ہیں، ہم لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ ہم یہ غلط کر رہے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے کا اصول

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مدرسہ تھا جس میں اساتذہ تھے اور ان کو تنخواہیں ملتی تھیں، تو وہاں پہلے دن سے یہ قاعدہ تھا کہ

ہر استاد جس کے ذمے کوئی ڈیوٹی لگی ہوئی ہے کہ وہ ایک گھنٹا سبق پڑھانے کا تو اگر کوئی مدرسے کے اوقات میں ملنے کے لیے آگیا تو اسی وقت ٹائم نوٹ کرلیا کہ اتنے وقت سے لے کر اتنے وقت تک میں اپنے مہمان کے ساتھ ذاتی گفتگو میں مصروف رہا اور مدرسے کا کام چھوڑ دیا اور اپنے ذاتی کام میں لگا رہا۔ تو جب تنخواہ لینے کا وقت آتا ہے تو پورا حساب کر کے تنخواہ دینے والے کو دیتے تھے کہ اتنے دن میں نے اپنے کام میں صرف کیے تھے، لہٰذا اتنے پیسے میری تنخواہ میں سے کاٹ لیے جائیں، کیونکہ یہ میری تنخواہ حلال نہیں ہوگی، یہ کام حضرت کے ہاں مستقل تھا، ہر شخص یہ کام کرتا تھا۔

الحمد للہ! ہمارے دارالعلوم میں بھی یہ کام ہے کہ جو استاد آتا ہے وہ اپنے آنے کا وقت رجسٹر میں درج کرتا ہے کہ فلاں وقت میں حاضر ہوا، اتنی دیر ہوگئی، تو پورے مہینے کا حساب لگا کر اتنے وقت کی تنخواہ کاٹی جاتی ہے، تو یہ اس لیے کہ اگر اس وقت کی تنخواہ آدمی وصول کرلے تو وہ تنخواہ حرام ہوگئی اور حرام کے نتیجے میں یہ ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

آج زمانہ ایسا آگیا کہ ہر شخص اپنے فائدے کی چیز حاصل کرنے کی فکر میں ہے حقوق مانگتا ہے کہ ہمارے حقوق ملنے چاہییں، لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس کے ذمے جو دوسروں کے حقوق ہیں وہ پورے کر رہا ہے کہ نہیں، آج لوگوں کو یہ حدیث تو بڑی یاد ہے:

"أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه"(۱)

"مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو"۔

---

(۱) قد مر تخريجه، انظر ص ۱۲۲.

تو کوئی کہیں مزدوری کرتا ہے نوکری کرتا ہے تو یہ حدیث خوب یاد ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے میری مزدوری ملنی چاہیے۔ تو ایک صاحب نے مجھ سے یہ ذکر کیا تو میں نے کہا ٹھیک ہے بھائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو، لیکن تم یہ دیکھو کہ پسینہ نکلا بھی ہے کہ نہیں، اگر پسینہ ہی نہیں نکلا تو خشک ہونے سے پہلے کہاں سے ادا کرو۔ جتنی تمہاری ذمہ داری ہے وہ تو پوری کرو اور اس ذمہ داری کو پوری کرنے کے بعد اجرت کا مطالبہ کرو، تمہیں حق پہنچتا ہے، لیکن یہ کہ اپنے فرائض میں تو ہے کوتاہی، اپنے فرائض تو صحیح طور سے ادا نہیں کر رہے، دیر سے پہنچ رہے ہیں وقت ضائع ہو رہا ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں ہمارے حقوق ملنے چاہئیں۔ تو قرآن اور حدیث اس طریقہ کار کی اجازت نہیں دیتے، یہ حرام راستہ ہے، تو اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے، آدمی یہ دیکھے کہ جو بھی میرا ذریعہ آمدنی ہے چاہے وہ تجارت ہو چاہے ملازمت ہو یا کسی خدمت کے ذریعے ہو، کسی ڈیوٹی کے ذریعے ہو، میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں کہ نہیں؟ اگر کر رہا ہے تو بے شک رزق حلال ہے اور اگر نہیں کر رہا ہے تو رزق کے اندر حرام شامل ہو رہا ہے اور یہ ساری بے برکتیاں پیدا ہو رہی ہیں جو معاشرے کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔

بے برکتی اور بدعنوانی کا عذاب

اب کئی مرتبہ لوگ آ کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ جی ہمارے محکمے میں لوگ ہیں وہ آتے ہیں اور دو تین گھنٹے گزارتے ہیں اور ہم سے کہتے ہیں کہ حاضری پوری لگاؤ اور وقت پورا درج کرو، تو ہمیں حاضری لگانے پر مجبور کرتے ہیں، تو جب میں نے ان کو بتایا کہ یہ جائز نہیں کہ کام کچھ نہیں ہوتا اور تنخواہ لینے کے

لیے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ساری حرام آمدنی ہے اور یہ جو بے برکتی آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب اس حرام آمدنی کی وجہ سے ہے۔ یہ جو لوٹ مار مچی ہوئی ہے کسی کی جان مال آبرو محفوظ نہیں یہ ویسے تو نہیں آتے یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اَن دیکھے اسباب ہوتے ہیں، بظاہر دیکھنے میں وہ اسباب نظر نہیں آرہے، لیکن حقیقت میں یہ عذاب ہے جو ہمارے اوپر مسلط ہے اس حرام خوری کا، قوم کی قوم کرپشن میں مبتلا ہوگئی ہے، قوم کی قوم رشوت خور ہوگئی ہے اور اس کے نتیجے میں ساری قوم سزا بھگت رہی ہے اور یاد رکھو اس حرام آمدنی کا فائدہ حقیقت میں دیکھو تو کسی کو نہیں پہنچتا، سب مصیبت کا شکار رہتے ہیں، جو آدمی ایک جگہ سے رشوت لیتا ہے اسے دس جگہ پر رشوت دینی پڑتی ہے، اگر حساب لگا کے دیکھو تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کچھ بھی نہیں ملا، ایک جگہ کسی نے رشوت لی ہے اور دس جگہ دینی پڑی، نتیجہ بے برکتی اور ظلمت علیحدہ، گناہ کا ایک سیلاب امڈا ہوا ہے اس کی وجہ سے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل و کرم سے اس کی اہمیت ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے کہ لقمہ ہمارے منہ میں جارہا ہے کم از کم اس کی فکر ہو کہ وہ حلال کا ہو حرام کا نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدتِ احتیاط

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ کی نماز پڑھانے کے لیے تشریف لے گئے، وہاں سے واپس آرہے تھے تو قریب میں ایک خاتون کا گھر پڑتا تھا، اس خاتون کے دل میں یہ بات آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں قریب تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست پیش کردوں کہ آپ کچھ دیر کے لیے میرے گھر میں تشریف لے

آئیں اور کچھ تناول فرمالیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں تشریف لے آئیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا تو اب اس خاتون نے چاہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خاطر تواضع کروں، کچھ کھانا وغیرہ پیش کروں۔ چنانچہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا لقمہ لیا تو ابھی منہ میں ڈالا تھا کہ ایک دم سے آپ نے روک دیا چھوڑ دیا اور فرمایا کہ یہ بکری جو ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اجازت کے حاصل کی گئی ہے، لہٰذا اس خاتون کو بلایا گیا اور اس سارے واقعے کی تفصیل دریافت کی گئی، اس پر اس نے بتایا کہ میں نے بکری منگوانے کے لیے کسی کو بھیجا تھا، لیکن بکری نہ ملی، پھر میں نے اپنے پڑوسی سے بکری خریدنا چاہی، اس نے تو انکار کر دیا، لیکن میں نے اس کی بیوی سے کہا کہ مجھے بکری بیچ دو۔ اس کی بیوی نے شوہر کی اجازت کے بغیر بکری بیچ دی تھی، اس بکری کا گوشت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بکری کا گوشت قیدیوں کو کھلا دو۔ (۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے:

"لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه" (۲)

---

(۱) مسند ابن ابی شیبہ ۴۱۰/۲ (۹۳۵) طبع دار الوطن -الریاض- ومسند احمد ۱۸۵/۳۷ (۲۲۵۰۹) وسنن ابی داود ۲۴۴/۳ (۳۳۳۲) والحدیث سکت عنه ابو داود والمنذری فی "مختصره".

(۲) مسند ابی یعلی ۱۴۰/۳ (۱۵۷۰) وقال الهیثمي في "المجمع" ۳۰۵/۴ (۶۸۶۶): رواه أبو یعلی، وأبو حرة وثقه أبو داود، وضعفه ابن معین.

"کسی مسلمان کا مال تمہارے لیے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے"۔

کسی کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں

غور سے سمجھیے کہ کسی کا مال خوش دلی کے بغیر حلال نہیں کہ اگر آپ نے زبردستی اصرار کر کے لے بھی لیا کسی طرح، لیکن وہ دل سے راضی نہیں تھا تو بھی آپ کے لیے حلال نہیں چاہے اس نے آپ کو دے دیا، کسی کے سر پر جا کے سوار ہو گئے آپ اور کہہ رہے ہو دو۔ اب وہ دینا نہیں چاہ رہا، مگر آپ اصرار کر رہے ہیں اور اصرار کرنے کے نتیجے میں اس نے کہا کہ بھائی دے دو اس کو جان چھوٹے اس سے، تو اگر اس طرح کسی سے لیا آپ نے اور اس نے بظاہر آپ کو دے بھی دیا، لیکن چونکہ خوش دلی نہیں ہے اس واسطے حلال نہیں، اسی طرح بعض اوقات خرید و فروخت کے اندر یہ معاملہ ہو جاتا ہے، مثلاً آپ کچھ خریدنے گئے اور اس نے آپ کو قیمت بتائی، آپ نے اس میں کمی کروائی اور کمی اتنی کروائی کہ وہ بیچارہ اس کمی پر دینے کو تیار نہیں اور آپ کہتے ہیں کہ نہیں جی آپ کو تو دینا ہی ہوگا، اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اتنی کم قیمت پر دینے کا، لیکن آخر میں مجبور ہو کر کسی طرح اس نے آپ کو دے دیا کم قیمت پر، لیکن اس نے یہ کمی خوش دلی سے نہیں کی مجبوراً کی، تو یہ مجبوری میں کمی کرائی گئی یہ آپ کے لیے حلال اور پاکیزہ نہیں، کیونکہ اس آدمی کی خوش دلی کے بغیر آپ نے یہ حاصل کی، اسی طرح چندہ وغیرہ جمع کیا جاتا ہے۔

چند معاشرتی برائیوں پر تبصرہ

چندے میں بعض اوقات آدمی محض لوگوں کے اس خطرے سے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو لوگوں میں میری بدنامی ہوگی۔ دل نہیں چاہ رہا دینے کو، لیکن اس ڈر سے دے دیا تو لینے والے کے لیے وہ حلال نہیں۔

شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اندر سے دل نہیں چاہ رہا تھا دینے کو، لیکن اس واسطے دے دیا کہ اگر نہیں دوں گا تو یہ برا مانے گا اور میری ناک کٹ جائے گی، تو وہ خوش دلی سے نہیں دیا جارہا ہے، اس واسطے وہ حلال نہیں پاکیزہ نہیں۔

صرف یہ بات نہیں کہ اجازت ہو، بلکہ اجازت بھی خوش دلی کے ساتھ ہو، اگر خوش دلی کے بغیر ہے تو وہ حلال نہیں کسی طرح سے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا، ہم سمجھتے ہیں کہ حرام وہ ہے جو چوری سے لیا جائے، ڈاکے سے لیا جائے اور جوا کھیل کے لیا جائے، لیکن یہ جو باتیں ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں کثرت سے خوش دلی کے بغیر۔

ایک اور وبا جو ہمارے ہاں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے کہ کسی سے کرائے پر مکان لیا اب مالک مکان یہ چاہتا ہے کہ تم یہ مکان خالی کرو، مجھے اس کی ضرورت ہے یا کوئی اور وجہ ہے، آپ کہتے ہیں کہ جی میں خالی نہیں کرتا، تو اب جتنے دن مالک کی اجازت کے بغیر اس میں رہ رہے ہو وہ رہائش حرام اور ناجائز ہے۔ اس واسطے کہ مالک کی اجازت اور خوش دلی کے بغیر اس کو استعمال کر رہے ہیں۔

اب یہ چیز سارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے کسی کے دل میں یہ خیال

نہیں آتا کہ میں یہ حرام کر رہا ہوں۔ صبح سے شام تک حرام ہو رہا ہے، جاگنے کے وقت سے لے کر سونے کے وقت تک سارا کا سارا حرام گزر رہا ہے، لیکن کسی کو اس کا خیال نہیں آتا اور کر رہے ہیں، تو رزقِ حرام میں صرف یہ چوری ڈاکے داخل نہیں، یہ سب چیزیں اس میں داخل ہیں، کسی کی چیز اٹھالی اور اس کو اس کی اجازت کے بغیر اور خوش دلی کے بغیر استعمال کر لیا تو اس کا استعمال حرام اور ناجائز ہے، چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہو، تو کسی کی خوش دلی کے بغیر اس کی چیز کو استعمال کرنا جائز نہیں، چاہے آپس میں قریبی تعلقات ہی کیوں نہ ہوں، تو جس چیز کے بارے میں سو فی صد یقین نہ ہو کہ یہ خوش دلی سے میرے استعمال کرنے پر راضی ہوگا اس وقت تک استعمال کرنا جائز نہیں۔

عام طور پر لوگوں کے اندر یہ بیماری ہے، کسی کے گھر گئے ٹیلی فون رکھا ہوا ہے اور اٹھا کر فون کرنا شروع کر دیا۔ پوچھا تک نہیں کہ میں کر سکتا ہوں کہ نہیں، کروں یا نہ کروں اور ٹیلی فون کر کرا کے اپنا الو سیدھا کرتے ہوئے چل دیے۔ یہ اجازت کے بغیر ہو رہا ہے، اس واسطے حرام ہے، ناجائز ہے۔ تو ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں دھیان نہیں تو یہ سب کام حرام ہو رہے ہیں، تو یہ سارا کا سارا وبال اسی کا پھیلا ہوا ہے۔

تو بھائی خدا کے لیے ہم اپنی جانوں پر رحم کریں، کم از کم اتنا تو ہو کہ جو کھا رہے ہیں وہ حلال ہو، جو برت رہے ہیں وہ حلال ہو اور اس میں کوئی ظلم کا پہلو نہ ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ناراض کرنے کا پہلو نہ ہو۔ اطمینان کر لو کہ جو لقمہ پیٹ میں جا رہا ہے وہ حلال ہے۔

حلال وحرام کی تمیز مٹتی جارہی ہے

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے اندر حلال وحرام کی تمیز ہوتی تھی کہ یہ لقمہ جو پیٹ میں جارہا ہے کہیں حرام کا تو نہیں، لوگوں کو اگر پتہ چل جائے کہ صدقہ کا گوشت کھایا ہے تو اسے ایک بدنامی کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی مسلمان صدقے کا گوشت کھائے۔ اب سارے مسلم ملکوں کے اندر امپورٹڈ (imported) گوشت آرہا ہے۔ کوئی آسٹریلیا سے، کوئی نیوزی لینڈ سے، کوئی برازیل سے، کوئی کہیں اور سے کوئی کہیں سے۔ اور گوشت کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں، کسی کو پرواہ نہیں کہ حلال طریقے سے ذبح ہوا کہ نہیں اور حرام کھارہے ہیں۔

جب یہاں پر کراچی میں مکڈونلڈ کھلا تو معلوم ہوا کہ ایک طوفان ہے انسانوں کا جو کھانے کے لیے پہنچ گیا اور ایسے افراد جو یہ پوچھ رہے ہیں کہ آخر یہ ایک یہودی کمپنی ہے تو اس نے جو گوشت رکھا ہے حلال ہے یا حرام ہے۔ اس کو پوچھنے والا شاید ہزار میں کوئی ایک ہو، اکا دکا کسی نے پوچھ لیا تو ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ الحمد للہ ایسا کھلا حرام نہیں ہے کیونکہ جہاں سے منگوایا جارہا ہے تو میں نے پتہ کیا کہ حرام نہیں حلال ہے، لیکن میں کہہ رہا ہوں کہ فکر، لیکن وہاں جانے سے پہلے، ہجوم لگانے سے پہلے، ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ معلوم کیا ہوتا کہ آیا یہ ہمارے لیے کھانا حلال ہے کہ نہیں، مگر وہ حلال وحرام کی فکر مٹ گئی، اس کے نتیجے میں کسی کو دھیان ہی نہیں یہ پتہ نہیں کہ حرام چیز ہمارے حلق میں جائے گی تو اندر جا کر فساد پھیلائے گی، ہماری زندگیوں میں ہمارے اخلاق میں ہمارے اعمال میں ہماری ہر چیز میں فساد مچائے گی۔

تو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت فرما رہے ہیں کہ اگر یہ خصلت تمہارے دل میں پیدا ہوگئی کہ حلال کھانے کا اہتمام کہ میرے منہ میں کوئی حرام چیز نہ جائے، جس دن یہ مل گیا تو سمجھ لو کہ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لیے جمع ہوگئیں، سب سے پہلے دیکھو کہ وہ چیز حلال ہے کہ نہیں، حلال طریقے سے حاصل ہوئی ہے کہ نہیں، جن پیسوں سے وہ چیز خریدی گئی ہے وہ پیسے حلال کے تھے یا حرام کے، اس کی فکر پیدا کرلیں، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی برکات اور انوارات تمہیں دکھائیں گے، ایک ایک پیسے کے اندر نور معلوم ہوگا، ایک ایک پیسے میں برکت معلوم ہوگی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

سچائی کو اپنا شعار بنائیے

تیسری صفت یہ بتائی کہ بات میں سچائی ہو کہ جو بات منہ سے نکلے قلم سے نکلے وہ سچی ہو، اس میں جھوٹ کا شائبہ نہ ہو اور یہ جھوٹ اتنی بری بلا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مشرکین اور کافر بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے، ابو سفیان کہتے ہیں جو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن تھے، ہرقل کے دربار میں گئے، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی چاہیں تو ان کو بلایا۔ تو کہتے ہیں کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ان کے سامنے کہہ دوں، مگر مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کہتا ہوں تو وہ جھوٹ ہوتی اور مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ یہ کہیں کہ ابو سفیان نے جھوٹ بولا۔ (۱)

---

(۱) صحیح البخاری ۷/۱ (۸) وصحیح مسلم ۱۳۹۳/۳ (۱۷۷۳).

کفر کی حالت میں یہ بات کہہ رہے ہیں، تو جھوٹ بولنے کو کافر اور مشرک بھی برا سمجھتے ہیں اور آج معاشرے کے اندر جھوٹ عام ہوگیا، زبان سے بات نکالتے ہوئے اس بات کی پروانہیں ہے کہ واقعے کے مطابق بات نکل رہی ہے یا واقعے کے خلاف۔ جھوٹ پھیلا ہوا ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

"تحروا الصدق وإن رأيتم أن فيه الهلكة فإن فيه النجاة، واجتنبوا الكذب وإن رأيتم أن فيه النجاة فإن فيه الهلكة"(۱)

"یعنی سچ بولنے کی فکر کرو اگر چہ تمہیں سچ بولنے میں ہلاکت نظر آتی ہو کیونکہ سچ بولنے میں نجات ہے اور جھوٹ سے بچو اگر چہ تمہیں اس میں نجات نظر آرہی ہو کیونکہ جھوٹ میں ہلاکت ہے"۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سخت سے سخت حالات میں بھی زبان سے جھوٹ نکالنے سے پرہیز کیا، جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے لیے تشریف لے جارہے تھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ساتھ ہیں اور مکہ کے مشرکین نے ہرکارے دوڑائے ہوئے ہیں کہ کسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پکڑ کر لے آئیں اور آپ کے سر کی قیمت لگی

---

(۱) الزهد لهناد بن السری ج۲ ص ٦٣٥ ومكارم الاخلاق لابن ابی الدنيا ص ۵۱ حديث نمبر ۳۷ طبع مکتبہ القرآن القاهره وكتاب الصمت لابن ابی الدنيا ص ۲۲۷ حديث نمبر (٤٤٦) طبع دار الكتاب العربی۔ ذكره المنذری فی "الترغيب" ۳/۳٦۵ وقال رواه ابن ابی الدنيا فی كتاب الصمت ہكذا معضلا ورواته ثقات۔

ہوئی ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سو اونٹ کا انعام ملے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مشرکین کو پتہ چل جائے کہ حضور ﷺ کہاں ہیں اور آ کر پکڑ لیں تو راستہ میں ایک شخص ملا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا حضور ﷺ کو نہیں جانتا تھا۔ تو اس نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟ اب اگر حضور ﷺ کا نام بتاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ جا کر راز فاش نہ کردے اور اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائیں اور اگر نہیں بتاتے غلط بتاتے ہیں تو غلط بیانی ہوتی ہے، ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ ایمان والے کی مدد فرماتے ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا یہ میرے راہنما ہیں، مجھے راستہ دکھاتے ہیں، اس وقت بھی جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے صریح جھوٹ نہیں بولا، وہ شخص مطمئن ہو کر چلا گیا کہ ساتھ میں راہنما لے کر جا رہے ہیں۔(۱)

ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے دین کا راستہ دکھاتے ہیں دین میں میری راہنمائی کرتے ہیں۔

تو زبان سے جھوٹ کا کلمہ نکالنا یہ مسلمان کا شیوہ نہیں ہے، حالانکہ بعض حالات میں جب انسان کی جان پر بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی بھی ہے، لیکن مسلمان حتی الامکان جھوٹ نہیں بولے گا، کیونکہ یہ مومن کا کام نہیں اور جھوٹ یہ نہیں ہوتا کہ جان بوجھ کر جھوٹ کی غرض سے بولا جائے، بلکہ وہ تمام باتیں جو خلافِ واقعہ ہیں وہ سب جھوٹ میں آتی ہیں۔ چھٹیاں لینے کے لیے جو جھوٹے میڈیکل سرٹیفکیٹ چلتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہیں اور یہ بھی اسی طرح

---

(۱) صحیح البخاری ۶۲/۵ (۳۹۱۱).

حرام ہے جس طرح زبان سے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا، جھوٹے سرٹیفکیٹ چل رہے ہیں، جھوٹی شہادتیں دی جارہی ہیں، یہ جو سرٹیفکیٹ ہوتا ہے یہ درحقیقت شہادت اور گواہی ہوتا ہے اور قرآن نے جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم پلہ قرار دیا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۱)

''بت پرستی سے بچو اور جھوٹی گواہی سے بچو''۔

جھوٹے سرٹیفکیٹ جھوٹی گواہی ہیں

یہ جو جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری ہوتے ہیں یہ جھوٹی گواہیاں ہیں اور جھوٹی گواہی کے اوپر اتنا زبردست وبال ہے کہ ۔العیاذ باللہ۔ پھر بھی ہم لوگ شکوے کرتے ہیں کہ پیچھے جارہے ہیں، قومیں آگے بڑھ رہی ہیں، روز ہماری پٹائی ہورہی ہے، اس کا شکوہ کرتے ہیں جبکہ یہ ساری چیزیں معاشرے کے اندر ہم نے اپنے اوپر مسلط کی ہوئی ہیں تو بتائیں ذلت نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، پٹائی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا، جب اللہ تعالیٰ کے احکام کی اس طرح کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتو جھوٹ بولنا جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے گواہ لانا جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرنا یہ سب اس کے اندر داخل ہیں، انسان کی زبان سے، قلم سے، قدم سے کوئی بات خلاف واقعہ نہیں نکلنی چاہیے، اچھے اچھے بڑے دیندار لوگ، نمازوں کے پابند، تہجد کے پابند جب یہاں معاملہ آتا ہے تو اس میں سب پھسل جاتے ہیں کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ بنوالو کوئی بات نہیں، جھوٹ بول دو کوئی بات نہیں، مسلمان کا یہ کام نہیں۔

(۱) سورۃ الحج آیت (۳۰)۔

دوسروں کے رازوں کی حفاظت کیجیے

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرمارہے ہیں کہ دوسری صفت جو انسان کے اندر ہونی چاہیے وہ ہے سچائی اور آخری بات فرمائی:

"حفظ أمانة"

"امانت کی حفاظت"

کسی کے پاس کوئی چیز امانت ہے تو اس میں خیانت نہ ہو، اس میں انسان ناجائز تصرف نہ کرے، مثلاً آپ کے پاس کسی شخص نے پیسے رکھوائے تو اس کی حفاظت کرو، یہ بھی امانت میں داخل ہے، لیکن بہت سی امانتیں ایسی ہیں کہ جن کے امانت ہونے کا ہمیں خیال نہیں ہوتا، حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"المجالس بالأمانة"(۱)

"مجلسیں امانت ہوتی ہیں"۔

اگر کسی نے آپ کو اپنے کسی راز کی بات بتائی ہے تو وہ راز بھی آپ کے پاس امانت ہے اور اگر آپ اس راز کو دوسرے لوگوں کے سامنے ظاہر کریں گے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہوگی، کسی شخص نے آپ پر اعتماد کرکے آپ سے کوئی بات کہہ دی اور ذہن میں یہ خیال ہے کہ یہ اسی حد تک رہے گی تو جب آپ اس

---

(۱) سنن ابی داود ٤/٢٦٨ (٤٨٦٩) والحديث سكت عنه أبو داود، وقال المنذري في "مختصره" ٤/٣٩٠ (٤٧٠٢): ابن أخي جابر مجهول، وفي إسناده عبد الله بن نافع الصائغ مولى بني مخزوم مدني، كنيته أبو محمد، وفيه مقال.

سے اجازت نہ لے لیں کہ دوسروں سے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں اس وقت تک آپ کے لیے دوسری جگہ کہنا جائز نہیں، یہ بھی امانت میں شامل ہے، مثلاً کسی شخص سے آپ نے کوئی چیز عاریتاً لی ہے تو وہ اس کی امانت ہے، اس کو واپس پہنچانا ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا [1]

''امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچاؤ یہ تمہارا فریضہ ہے''۔

لوگ قرضے لیتے ہیں، ادائیگی کے اندر ٹال مٹول کرتے ہیں، امانتیں لیتے ہیں اس کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں، یہ سب خیانت کے اندر داخل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان بد اعمالیوں سے نجات عطا فرمائے اور جو چار صفتیں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کے اندر پیدا فرمادے۔ آمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۵۸)۔
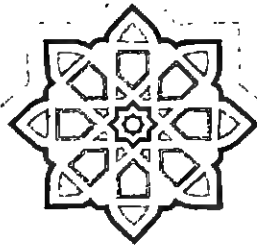
(فرد کی اصلاح ص ۹۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رشوت ایک سنگین گناہ

رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے

بعض برائیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہوسکتی ہیں، ایک شخص کے نزدیک وہ برائی ہے اور دوسرا اسے کوئی عیب نہیں سمجھتا، لیکن رشوت ایسی برائی ہے جس کے برا ہونے پر ساری دنیا متفق ہے۔ کوئی مذہب وملت، کوئی مکتب فکر یا انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ملے گا جو رشوت کو بد ترین گناہ یا جرم نہ سمجھتا ہو۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ دن کے وقت دفتروں میں بیٹھ کر دھڑلے سے رشوت کا لین دین کرتے ہیں وہ بھی جب شام کو کسی محفل میں معاشرے کی خرابیوں پر تبصرہ کریں گے تو ان کی زبان پر سب سے پہلے رشوت کی گرم بازاری ہی کا شکوہ آئے گا اور اس کی تائید میں وہ (اپنے نہیں) اپنے رفقائے کار کے دو چار واقعات سنا دیں گے۔ سننے والے یا تو ان واقعات پر ہنسی مذاق میں کچھ فقرے چست کردیں گے یا پھر کوئی بہت سنجیدہ محفل ہوئی تو اس میں غم وغصے کا اظہار کیا جائے گا، لیکن اگلی ہی صبح یہی شرکائے مجلس پورے

اطمینان کے ساتھ اسی کاروبار میں مشغول ہوجائیں گے۔

غرض رشوت کی خرابیوں سے پوری طرح متفق ہونے کے باوجود کوئی شخص جو اس انسانیت سوز حرکت کا عادی ہوچکا ہو اسے چھوڑنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا اور اگر اس بارے میں کسی سے کچھ کہا جائے تو مختصر سا جواب یہ ہے کہ ساری دنیا رشوت لے رہی ہے تو ہم کیا کریں؟ گویا ان کے نزدیک رشوت چھوڑنے کی شرط یہ ہے کہ پہلے دوسرے تمام لوگ اس برائی سے تائب ہوجائیں، تب ہی چھوڑنے پر غور کرسکتا ہوں اس کے بغیر نہیں اور چونکہ رشوت لینے والے کے پاس یہی بہانہ ہے، لہٰذا یہ تباہ کن بیماری وبا کی شکل اختیار کرچکی ہے، فرق یہ ہے کہ جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو وہاں کوئی مریض یہ استدلال نہیں کرتا کہ جب تک تمام دوسرے لوگ تندرست نہ ہوجائیں میں بھی صحت کی تدبیر نہیں کروں گا، لیکن رشوت کے بارے میں یہ استدلال ناقابلِ تردید سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی استدلال نہیں، ایک بہانہ ہے اور بات صرف یہ ہے کہ رشوت لینے والے کو اپنے اس عمل میں فوری طور سے مالی فائدہ ہوتا نظر آتا ہے اس لیے نفس اس فائدے کو حاصل کرنے کے لیے ہزار حیلے بہانے تراش لیتا ہے، لیکن آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ رشوت لینے میں واقعۃً کوئی فائدہ ہے بھی یا نہیں؟ بظاہر تو رشوت لینے میں یہ کھلا فائدہ نظر آتا ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کسی زائد محنت کے بغیر بڑھتی جاتی ہے، لیکن اگر ذرا باریک بینی سے کام لیا جائے تو اس وقتی فائدے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک ٹائیفائڈ میں مبتلا بچے کو چٹ پٹی غذاؤں میں بڑا لطف آتا ہے، لیکن بچے کے ماں باپ یا اس کے معالج جانتے ہیں کہ یہ چند لمحوں کا فائدہ نہ صرف اس کی تندرستی کو دور سے دور تر

کردے گا، بلکہ انجام کار اسے زیادہ طویل عرصے تک لذیذ غذاؤں سے محروم ہونا پڑے گا۔

یہ مثال صرف رشوت کے اخروی نقصانات پر ہی صادق نہیں آتی، بلکہ ذرا انصاف سے کام لیا جائے تو رشوت کے دنیوی نقصانات کے بارے میں بھی اتنی ہی سچی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب معاشرے میں یہ لعنت پھیلتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے ایک شخص کسی ایک جگہ سے کوئی رشوت وصول کرتا ہے تو اسے دسیوں جگہ خود رشوت دینی پڑتی ہے، بظاہر تو وہ ممکن ہے کہ اسے آج سو روپے زیادہ ہاتھ آگئے، لیکن کل جب اسے خود دوسرے لوگوں سے کام پڑے گا تو یہ سو روپے نہ جانے کتنے سو ہو کر خود اس کی جیب سے نکل جائیں گے۔

پھر رشوت کا یہ نقد نقصان کیا کم ہے کہ اس کی بدولت پورا معاشرہ بدامنی اور بے چینی کا جہنم بن جاتا ہے، کیوں کہ کسی بھی ملک میں باشندوں کے امن وسکون کی سب سے بڑی ضمانت اس ملک کا قانون اور اس قانون کے محافظ ادارے ہی ہو سکتے ہیں، لیکن جس جگہ رشوت کا بازار گرم ہے وہاں بہتر سے بہتر قانون بھی بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے، آج جب ہم معاشرے کی بدامنی کو ختم کرنے کے لیے کوئی قانون بنانے بیٹھتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ پیش آتا ہے کہ اس قانون کو رشوت کے زہر سے کیسے بچایا جائے؟ چوری ڈاکے، قتل، اغوا، بدکاری اور دھوکے فریب کے انسانیت کش حادثات سے آج ہر شخص سہما ہوا ہے، لیکن یہ نہیں سوچتا کہ ان حادثات کے روز افزوں ہونے کے سبب درحقیقت وہ رشوت ہے جو ہر اچھے سے اچھے قانون کو چند نوٹوں کے عوض بیچ کر اس کی ساری افادیت خاک میں ملا دیتی ہے اور جسے ہم نے اپنے روز مرہ کے

طرزِ عمل سے شیرِ مادر بنا کر رکھ دیا ہے۔

ہم نے اگر کسی مجرم سے رشوت لے کر اسے قانون کی گرفت سے بچا لیا ہے تو درحقیقت ہم نے جرم کی اہمیت، قانون کے احترام اور سزا کی ہیبت کو دلوں سے نکالنے میں مدد دی ہے اور ان مجرموں کا حوصلہ بڑھایا ہے جو کل خود ہمارے گھر پر ڈاکہ ڈال سکتے ہیں۔

ایک سرکاری افسر کسی سرکاری ٹھیکے دار سے رشوت لے کر اس کے ناقص تعمیری کام کو منظور کرا دیتا ہے اور مگن ہے کہ آج آمدنی زیادہ ہوگئی، لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ جس ناقص پل کی تعمیر پر اس نے صاد کرا دیا ہے کل جب گرے گا تو اس کی زد میں خود وہ اور اس کے بچے بھی آسکتے ہیں، جس ناقص مال کی بنی ہوئی سڑک اس نے منظور کرادی ہے وہ ہزارہا دوسرے افراد کی طرح خود اس کے لیے بھی عذابِ جان بنے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری کاموں کے سلسلے میں رشوت کے عام لین دین سے ہم نے سرکاری خزانے کو جو نقصان پہنچایا اس کا بار کوئی حکمران بھی نہیں اٹھائے گا، بلکہ اس کے نتائج زائد ٹیکسوں کی شکل میں ملک کے تمام باشندوں کو بھگتنے پڑیں گے جن میں ہم خود بھی داخل ہیں، اس سے ملک میں گرانی ہوگی، خزانہ کمزور پڑے گا، ملک کے ترقیاتی کام بھی رکیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی منزل بھی دور ہوگی اور دوسری اقوام ہمیں بدستور لقمہ تر سمجھتی رہیں گی۔

یہ تو چند سرسری مثالیں تھیں، لیکن اگر ہم ذرا اس رخ سے مزید سوچیں تو اندازہ ہوگا کہ رشوت کے لین دین کی بدولت ہم خود دنیا میں مستقل طور سے کن پیچیدہ مصائب اور سنگین مشکلات میں مبتلا ہوگئے ہیں؟

رشوت کے یہ دنیوی نقصانات تو اجتماعی نوعیت کے ہیں اور بالکل سامنے کے ہیں، لیکن اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھیے تو خاص رشوت لینے والے کی انفرادی زندگی بھی رشوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہتی، حدیث میں ہے کہ

> رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے رشوت دینے والے پر بھی رشوت لینے والے پر بھی اور رشوت کے دلال پر بھی۔ (۱)

جس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی ہو اس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی شخص پر لعنت بھیجنا معمولی بات نہیں۔ اس کا اثر آخرت میں تو ظاہر ہوگا ہی، لیکن دنیا میں بھی یہ لوگ اس لعنت کے اثر سے نہیں بچ سکتے، چنانچہ جو لوگ معاشرے کو تباہی کے راستے پر ڈال کر حق داروں کا دل دکھا کر، غریبوں کا حق چھین کر اور ملت کی کشتی میں سوراخ کرکے رشوت لیتے ہیں بظاہر ان کی آمدنی میں خواہ کتنا اضافہ ہوجاتا ہو، لیکن خوشحالی اور راحت وآسائش روپے پیسے کے ڈھیر، عالیشان کوٹھیوں، شاندار کاروں اور اپ ٹو ڈیٹ فرنیچر کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کے اس سکون، روح کے اس قرار اور ضمیر کے اس اطمینان کا نام ہے جسے کسی بازار سے کوئی بڑی سے بڑی قیمت دے کر بھی نہیں خریدا جاسکتا، یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی دین ہوتی ہے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو یہ دولت دیتا ہے تو ٹوٹی جھونپڑی، کھجور کی چٹائی اور ساگ روٹی میں بھی دے دیتا ہے اور کسی کو نہیں دیتا تو شاندار بنگلوں، کاروں اور کارخانوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

---

(۱) مسند احمد ۸۵/۳۷ (۲۲۳۹۹) وقال المنذری فی "الترغیب والترهيب" (۱۲۶/۳): رواه الإمام أحمد، والبزار، والطبراني، وفيه أبو الخطاب لا يعرف.

آج اگر آپ کو رشوت کے ذریعے کچھ زائد آمدنی ہوئی ہے، لیکن ساتھ ہی کوئی بچہ بیمار پڑ گیا ہے تو کیا یہ زائد آمدنی آپ کو کوئی سکون دے سکے گی؟ آپ کی ماہانہ آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، لیکن اگر اسی تناسب سے گھر میں ڈاکٹر اور دوائیں آنے لگی ہیں تو آپ کو کیا ملا؟ اور اگر فرض کیجیے کہ کسی نے مرمار کر رشوت کے روپے پیسے سے تجوریاں بھر بھی لیں، لیکن اولاد نے باغی ہو کر زندگی اجیرن بنادی، داماد نے جینا دوبھر کر دیا یا اسی قسم کی کوئی اور پریشانی کھڑی ہوگئی تو کیا یہ ساری آمدنی اسے کوئی راحت پہنچا سکے گی؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے باغی ہو کر روپیہ تو جمع کر سکتا ہے، لیکن اس روپے کے ذریعے راحت وسکون حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں، عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت پریشانیوں اور آفتوں کا ایسا چکر لے کر آتی ہے جو عمر بھر انسان کو گردش میں رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کھلے الفاظ میں بتایا کہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ ایسے مصائب کا شکار کر دیے جاتے ہیں جن کی موجودگی میں لذیذ سے لذیذ غذا بھی آگ معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا رشوت خوروں کے اونچے مکانات اور شاندار اسباب دیکھ کر اس دھوکے میں نہ آنا چاہیے کہ انہوں نے رشوت کے ذریعے خوشحالی حاصل کر لی، بلکہ ان کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر افراد کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ حرام سے اجتناب کر کے اللہ کے دیے ہوئے حلال رزق پر قناعت کرتے ہیں، ابتداء میں انہیں کچھ مشکلات پیش آسکتی ہیں، لیکن

مآل کار دنیا میں بھی وہی فائدے میں رہتے ہیں، ان کی تھوڑی آمدنی میں بھی زیادہ کام نکلتے ہیں۔ ان کے اوقات اور کاموں میں بھی برکت ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دل کے سکون اور ضمیر کے اطمینان کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔

اوپر رشوت کے جو نقصانات بیان کیے گئے وہ تمام تر دنیوی نقصانات تھے اور اس لعنت کا سب سے بڑا نقصان آخرت کا نقصان ہے۔ دنیا میں اور ہزار چیزوں میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اس بارے میں کسی مذہب اور کسی مکتبِ فکر کا اختلاف نہیں کہ ہر انسان کو ایک نہ ایک دن موت ضرور آئے گی، اگر بالفرض رشوتیں لے لے کر کسی شخص نے چند روز مزے اڑا بھی لیے تو بالآخر اس کا انجام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"الراشی والمرتشی فی النار"(۱)

رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا جہنم میں ہوں گے۔

اور اس لحاظ سے رشوت کا گناہ شراب نوشی اور بدکاری سے بھی زیادہ سنگین ہے کہ شراب نوشی اور بدکاری سے اگر کوئی شخص صدقِ دل کے ساتھ توبہ کرلے تو وہ اسی لمحے معاف ہوسکتا ہے، لیکن رشوت کا تعلق چونکہ حقوق العباد سے ہے اس لیے جب تک ایک ایک حقدار کو اس کی رقم نہ چکائے یا اس سے معافی نہ مانگے تب تک اس گناہ کی معافی کا کوئی راستہ نہیں۔ عام طور سے جب انسان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اسے اپنی آخرت کی فکر لاحق ہو ہی جاتی ہے، اگر اس

(۱) مسند البزار ۲۴۷/۳ (۱۰۳۷) والمعجم الاوسط ۲۹۵/۲ (۲۰۲۶) ومسند احمد بن منیع کما فی "المطالب العالیة" ۱۸۷/۱۰ (۲۱۸۵) طبع دار العاصمة۔

وقت عارضی دنیوی مفاد کی لالچ میں ہم یہ گناہ کرتے رہے تو یقین رکھیے کہ موت سے پہلے ہی جب آخرت کی منزل سامنے ہوگی، تو یہ اعمال دنیا کے ہر آرام وراحت کو مستقل عذاب جان بنا کر رکھ دیں گے اور اس عذاب سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر تنہا میں نے رشوت ترک کردی تو اس سے پورے معاشرے پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن یہی وہ شیطان کا دھوکہ ہے جو معاشرے سے اس لعنت کے خاتمے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جب ہر شخص دوسرے کا انتظار کرے گا تو معاشرہ کبھی اس لعنت سے پاک نہیں ہوسکے گا۔ آپ رشوت کو ترک کر کے کم از کم خود اس کے دنیا اور آخرت کے نقصانات سے محفوظ ہوسکیں گے، اس کے بعد آپ کی زندگی دوسروں کے لیے نمونہ بنے گی، کیا بعید ہے کہ آپ کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس لعنت سے تائب ہوجائیں۔ تاریکی میں ایک چراغ جل اٹھے تو پھر چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ اتنا دراز ہوسکتا ہے کہ اس سے پورا ماحول بقعہ نور بن جائے، پھر جب کوئی شخص اللہ کے لیے اپنے نفس کے کسی تقاضے کو چھوڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوتی ہے، دور دور سے ایک کام کو مشکل سمجھنے کے بجائے اسے کر کے دیکھیے، اللہ تعالیٰ سے اس کی آسانی کی دعا مانگیے، ان شاء اللہ اس کی مدد ہوگی، ضرور ہوگی، بالضرور ہوگی اور کیا عجیب ہے کہ معاشرے کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو منتخب کیا ہو۔

مال میں برکت کیسے ہو

(انعام الباری ۶/ ۱۳۵)
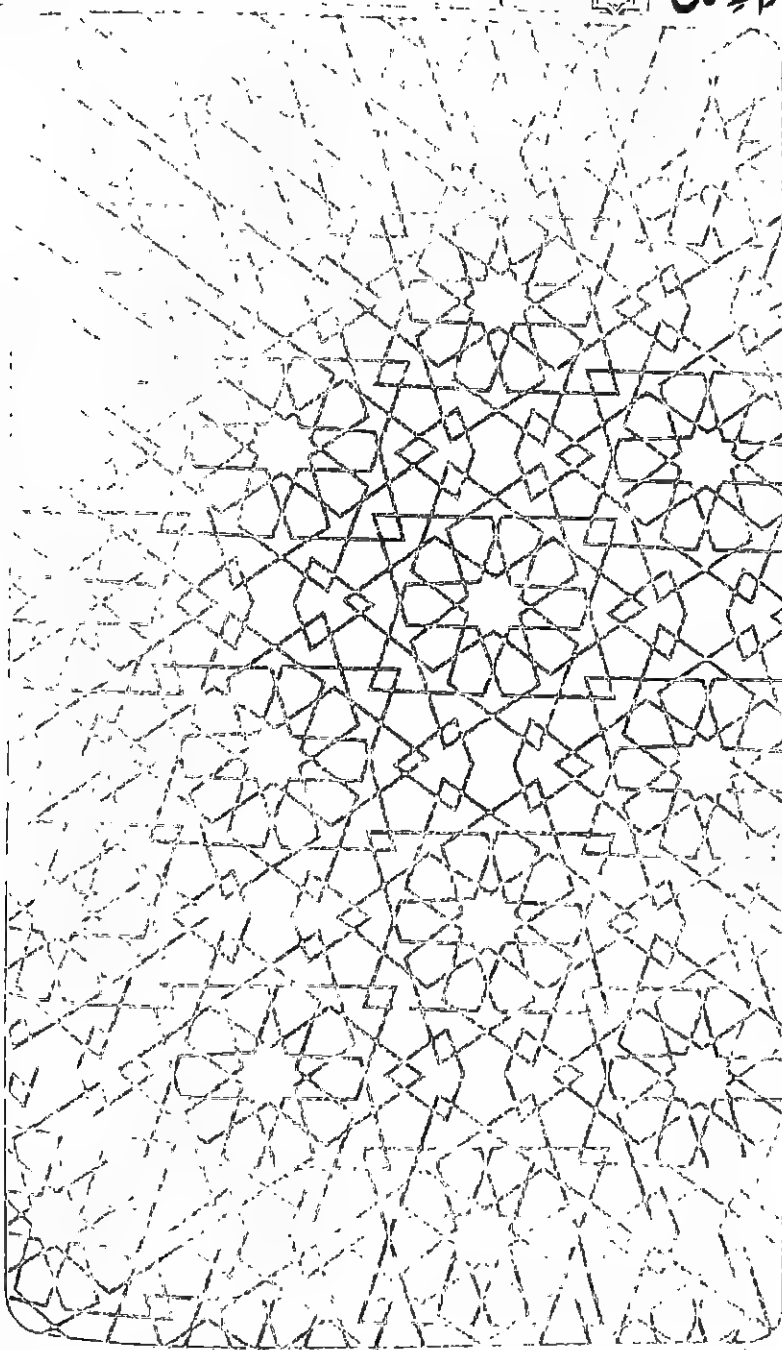
بسم اللہ الرحمن الرحیم

مال میں برکت کیسے ہو؟

قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "البَيِّعَانِ بِالخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا، - أَوْ قَالَ: حَتَّى يَتَفَرَّقَا - فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُورِكَ لَهُمَا فِي بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا"(۱)

برکت کے معنی ومفہوم

یہاں مقصود دوسرا جملہ ہے کہ "فإن صدقا وبينا" اگر وہ سچ بولے اور ساتھ ساتھ حقیقت بتادے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر جھوٹ بولے اور عیب چھپائے گا تو ان کی بیع کی برکت فنا کردی جاتی ہے، مٹادی جاتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچ بولنے پر برکت ہوتی ہے اور جھوٹ بولنے سے برکت مٹادی جاتی ہے۔

(۱) صحیح البخاری ۵۸/۳(۲۰۷۹)۔

اب مسئلہ ایسا ہوگیا ہے کہ برکت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے جو قدر و قیمت ہے وہ گنتی کی ہے، یعنی جس طرح بھی ہو پیسہ زیادہ آنا چاہیے، برکت کا مفہوم ذہن سے مٹ گیا ہے، جانتے ہی نہیں کہ برکت ہوتی کیا ہے۔

برکت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے پاس جو بھی چیز ہے اس کے اندر جو اس کا مقصود یعنی اس کی منفعت ہے وہ بھرپور طریقے سے حاصل ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کے جتنے بھی مال و اسباب ہیں ان میں کوئی بھی بذاتِ خود راحت پہنچانے والا نہیں ہے۔ مثلاً روپیہ ہے، اگر تم بھوک میں کھانا چاہو تو بھوک نہیں مٹا سکتا، کچھ حاصل نہیں ہوگا، پیاس لگی ہوئی ہے وہ پیاس نہیں مٹا سکتا، اس کے اندر بذاتِ خود بھوک مٹانے کی صلاحیت نہیں۔ اگر بیماری ہو تو بیماری کے اندر ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ کھاتے جاؤ اور بھوک نہیں مٹتی، ایسی بیماریاں بھی ہوتی ہیں کہ پانی پیتے جاؤ اور پیاس نہیں مٹتی۔ تو اصل مقصود راحت ہے، لیکن راحت ان اسباب کا لازمہ نہیں ہے کہ جب بھی مال و اسباب زیادہ ہوگا تو راحت ضرور ہوگی، بلکہ راحت تو کسی اور ہی چیز سے آتی ہے، وہ چاہے تو ایک روپیہ میں راحت دے دے اور نہ چاہے تو ایک کروڑ میں نہ دے۔ اس واسطے راحت جو کہ مقصودِ اصلی ہے اس کا نام برکت ہے اور یہ محض عطائے الٰہی سے آتی ہے اس کا اسباب کی گنتی سے کوئی تعلق نہیں۔

مثلاً ایک کروڑ پتی ہے جس کی ملیں کھڑی ہوئی ہیں، کاریں ہیں، کارخانے ہیں، مال و دولت ہے، بینک بیلنس ہے، لیکن جب رات کو بستر پر لیٹتا ہے نیند نہیں آتی اور کروٹیں بدلتا رہتا ہے، ایئر کنڈیشن چل رہا ہے، نرم و گداز گدا نیچے ہے اور صاحب بہادر کو نیند نہیں آرہی۔ تو یہ مسہری، یہ گدا، یہ ایئر کنڈیشن کمرہ اس کے لیے راحت کا سبب نہیں بن سکے، بے چینی کے عالم میں رات گزار دی۔ صبح

ڈاکٹر کو بلایا، ڈاکٹر گولیاں دیتا ہے کہ یہ کھاؤ تو نیند آئے گی۔

اگر مزدور ہے آٹھ گھنٹے کی محنت کر کے پسینے میں شرابور ہو کے اور ساگ سے روٹی کھا کے آٹھ گھنٹے جو بھر پور نیند لی صبح کو جا کر اس نے دم لیا۔

اب بتائیں کس کو راحت حاصل ہوئی؟ حالانکہ وہ کروڑ پتی تھا اور یہ بے چارہ مفلس ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے افلاس میں راحت پیدا فرمادی اور اس کروڑ پتی کو راحت نہیں ملی تو یہ محض اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔

آج لوگ اس حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ گنتی ہونی چاہیے، بینک بیلنس ہونا چاہیے، بینک میں پیسے زیادہ ہونے چاہئیں، یہ پتہ نہیں کہ جس رشوت سے پیسہ کمایا، دھوکہ سے یا جھوٹ سے کمایا اس کی گنتی تو بہت ہوگئی، لیکن اس نے ان کو نفع نہیں پہنچایا، اس سے راحت نہیں ملتی۔

ایک عبرت ناک واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ میں فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نواب تھا، نواب ریاست کے سربراہ کو کہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہیں تھی جو اس کے گھر میں موجود نہ ہو مگر ڈاکٹر نے کہہ رکھا تھا کہ آپ کی غذا ایک ہی چیز ہے، ساری عمر اسی پر گزارہ کریں گے، اگر ایسا کریں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے اور وہ یہ کہ بکری کا قیمہ ایک ململ کے کپڑے میں رکھ کر اور اس میں پانی ڈال کر اس کو نچوڑو، اب وہ جو پانی نکلا ہے بس آپ وہ پی سکتے ہیں، اگر دنیا کی کوئی اور چیز کھاؤ گے تو مر جاؤ گے، لہٰذا ساری عمر اسی قیمے کے پانی پر گزاری، نہ روٹی، نہ گوشت، نہ سبزی، نہ ساگ، نہ دال، نہ اور کچھ کھا سکا۔

تو اب بتائیں وہ کروڑ پتی پن کس کام کا جو آدمی کو ایک وقت میں کھانے کی لذت بھی فراہم نہ کرسکے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں برکت سلب ہوگئی اور یہ برکت پیسوں سے خریدی نہیں جاسکتی کہ بازار میں جاؤ اور برکت خرید لاؤ، اتنے پیسے دو اور خرید لو۔

حصولِ برکت کا طریقہ

برکت اللہ جل جلالہ کی عطا ہے اور یہ عطا کس بنیاد پر ہوتی ہے، میں نے بتادیا کہ اگر امانت سے کام کروگے، دیانت داری سے کام کروگے اور حلال طریقے پر کام کروگے تو برکت ہوگی اور اگر حرام طریقے سے کروگے ناجائز اور دھوکے بازی سے کروگے تو برکت سلب ہوجائے گی۔

لہٰذا چاہے تمہاری گنتی میں اضافہ ہورہا ہو، لیکن اس کا فائدہ تمہیں حاصل نہیں ہوگا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصولِ برکت کے لیے دعا کی تلقین کرنا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی ہے جب کسی کو دعا دو تو بارك الله کہہ دو[1]، یہ معمولی دعا نہیں ہے، یہ بڑی زبردست دعا ہے، اور ہمارے ہاں جو

---

(۱) مثلاً نکاح کے موقع پر یہ دعا وارد ہوئی ہے: "بارك الله لك وبارك عليك" رواه الترمذی ۳۸۵/۲ (۱۰۹۱) وغیرہ وقال الترمذی حدیث حسن صحیح۔ اور مسند احمد ۴۶۳/۲۲ (۱۴۶۲۲) میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے اونٹنی خریدی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس میں برکت کی دعا کی درخواست کی تو آپ نے انہیں دعا دی۔ از مرتب عفا اللہ عنہ

مشہور ہے کہ بھائی مبارک ہو آپ نے مکان بنایا، مبارک ہو آپ نے نکاح کیا، مبارک ہو آپ نے گاڑی خریدی، یعنی ہر چیز میں مبارک کی دعا دیتے ہیں یہ بڑی پیاری دعا ہے، اگر اس کو سوچ سمجھ کر دیا جائے اور لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز جو آپ کو ملی ہے اس کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو۔ یہ درحقیقت ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیز کچھ بھی نہیں ہے جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت نہ ڈالی جائے۔ مکان بے شک عالی شان بن گیا، لیکن عالی شان مکان کوئی حقیقت نہیں رکھتا جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے برکت عطا نہ ہو اور برکت عطا ہوگی تو اس کو راحت ملے گی، مکان تو ہے مگر مکان کی برکت نہیں ہے تو یہ مکان تمہارے لیے عذاب ہوجائے گا، یہ بڑے کانٹے کی بات ہے۔ دنیا آج گنتی کے پیچھے بھاگ رہی ہے، لیکن برکت کو نہیں دیکھتے اور جب کسی مالدار کو دیکھا کہ اس کے پاس عالی شان کوٹھی ہے، بنگلہ ہے، مل ہے، کار ہے اور کارخانے ہیں تو وہی بات دل میں آتی ہے:

يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (۱)

لیکن تمہیں نہیں پتہ کہ یہ جو ظاہری چمک دمک اور شان وشوکت ہے، ذرا اس کے دل میں جھانک کر دیکھو کہ ان تمام اسباب کے جمع کرنے کے باوجود وہ کن اندھیروں میں گرفتار ہے۔

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۹)۔

ظاہری چمک دمک پر نہیں جانا چاہیے

میرے پاس پچاسیوں بڑے بڑے سرمایہ دار، دولت مند آتے رہتے ہیں ایسے ایسے لوگ آتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آدمی یہی کہے "یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ"، لیکن جب وہ اپنے دکھڑے بیان کرتے ہیں کہ وہ کن دکھوں میں مبتلا ہیں تو واقعی مجھے عبرت ہوتی ہے کہ اس مال ہی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے عذاب بنا رکھا ہے۔

میرے پاس اکثر ایک خاتون مسئلہ وغیرہ پوچھنے کے لیے آتی رہتی ہیں، ان کے شوہر کے لیے ارب پتی کا لفظ بھی کم ہے اور اس عورت کو جب دوسری عورتیں دیکھتی ہیں کہ کیسا لباس پہنی ہوئی ہے، کیسی گاڑی میں آرہی ہے، کیسے مکان میں رہ رہی ہے، تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہوتی ہیں کہ کیسی زبردست عورت ہے، لیکن وہ جو آکر میرے سامنے بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ دولت نکال دے اور مجھے وہ سکون نصیب ہوجائے کہ جو ایک جھونپڑی والے کو حاصل ہوتا ہے، دیکھنے والے تو اس کی چکا چوند دیکھ رہے ہیں، لیکن میرے سوا یا اس کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہے۔ اس واسطے کبھی یہ ظاہری شان وشوکت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے چکر میں مت آؤ، اللہ تبارک وتعالیٰ دل کا سکون عطا فرمائے وہ راحت عطا فرمائے جسے برکت کہتے ہیں۔

ظاہری چمک دمک والوں کے لیے عبرت ناک واقعہ

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک غریب

آدمی تھا، وہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ کے پاس گیا اور جا کر ان سے کہا کہ حضرت میرے لیے دعا فرما دیجیے کہ میں بھی دولت مند ہو جاؤں، مشکلوں میں گرفتار ہوں اور دل یوں چاہتا ہے کہ بس سب سے امیر ترین بن جاؤں۔

پہلے تو انہوں نے سمجھایا کہ کس چکر میں پڑ گئے ہو، اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، لیکن وہ نہ مانا۔ تو بزرگ نے کہا کہ تم یہاں شہر میں کوئی دولت مند آدمی تلاش کرو جو بہت ہی امیر ترین ہو تو اس کا مجھے بتا دینا میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا بنا دے۔

اس نے شہر میں چکر لگا کر ایک سنار کو منتخب کیا جس کی دکان زیورات سے بھری ہوئی تھی، پانچ چھ لڑکے، ایک سے ایک خوبصورت ہیں اور کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں، ہنسی مذاق ہو رہا ہے، کھانے پینے کا ساز و سامان ہے، سب کچھ ہے غرض دنیا کی ساری نعمت ہے، اس نے کہا کہ بس یہی ہے۔

تو غریب آدمی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت! میں دیکھ کر آیا ہوں، ایک سنار بہت اعلیٰ درجے کا ہے، دعا کر دیجیے کہ میں ایسا ہو جاؤں، بزرگ نے حتی الامکان سمجھایا کہ پہلے معلومات کر لو پھر دعا کر دوں گا۔

بزرگ: بھائی ظاہری حالت تو دیکھ آئے ہو کسی وقت تنہائی میں اس سے پوچھ لو کہ تم خوش ہو کہ نہیں؟

تو یہ شخص ان بزرگ کے کہنے پر پھر گیا اور سنار سے تنہائی کا وقت لیا اور اس سے پوچھا کہ بھائی! تمہاری دکان دیکھی ہے، بڑی شان دار ہے، یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی جو کہ بڑی قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے کیسے گزرتی ہے؟

سنار: میاں کس چکر میں پڑ گئے ہو، میں تو اس روئے زمین پر ایسا مصیبت

زدہ شخص ہوں کہ زمین پر مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص مصیبت زدہ ہو ہی نہیں سکتا، بات در اصل یہ ہے کہ میں یہ سونے کا کاروبار کرتا تھا اور اس میں خوب آمدنی تھی، بیوی بیمار ہوگئی، بہت علاج کرایا، صحیح نہیں ہوئی، پریشانی رہی، آخر میں بیوی بالکل مایوس ہوگئی، مجھے بیوی سے بہت محبت تھی، بیماری کے عالم میں بیوی مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے تو خیال ہے کہ جب میں مرجاؤں گی تو تم دوسری شادی کر لوگے اور مجھے بھول جاؤ گے، میں نے کہا کہ نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دوسری شادی نہیں کروں اور تم سے اتنی محبت ہے کہ اس کے بعد میں دوسری کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا اس واسطے شادی نہیں کروں گا۔

اس نے کہا کہ کوئی یقین دلاؤ۔ میں نے کہا کہ میں قسم کھانے کو تیار ہوں، کہا کہ قسم کا مجھے بھروسہ نہیں۔ آخر کار اس کو یقین دلانے کی خاطر میں نے اپنا عضو تناسل کاٹ دیا۔ اس کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تندرست ہوگئی، مگر میں مردانہ قوت سے محروم ہو چکا تھا۔ تو ایک عرصہ اس طرح گزرا۔ وہ بھی آخر جوان تھی تو اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ شوہر کے ساتھ تو کوئی راستہ اب ہے نہیں تو اس نے گناہ کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا اور یہ جو خوبصورت بچے دکان میں نظر آرہے ہیں ناجائز اولاد ہیں، تو میں ان کے ساتھ رہتا ہوں اور ان کو دیکھتا ہوں تو کڑھتا ہوں۔ ساری زندگی میری اس گھٹن میں گزر رہی ہے تو مجھ سے زیادہ کوئی مغموم اس دنیا ملے گا نہیں۔

لہٰذا یہ جتنے چمک دمک والے نظر آتے ہیں ان کی زندگیوں کے اندر جھانک کر دیکھو تو پتہ لگے گا کہ کیا اندھیرے ہیں، لہٰذا اللہ سے مانگنے کی چیز صرف عافیت ہے اور راحت ہے۔ اللہ تعالیٰ عافیت اور راحت عطا فرمائے، پھر

جو کچھ عطا فرمائے اس میں برکت عطا فرمائے۔

اب دیکھیں حدیث میں ہر جگہ جہاں بھی دیکھیں گے بار بار یہ دعا ہے کہ

"بَارِكْ لَنَا فِيمَا أَعْطَيْتَنَا"[1]

لیکن اس کی قدر و قیمت آج دنیا سے مٹ گئی ہے اور گنتی کی ہوگئی ہے، ہمارے پیسے زیادہ ہونے چاہئیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اصل چیز دیکھو برکت ہے کہ نہیں

"فإن صدقا وبينا بورك لهما فی بيعهما وإن كتما وكذبا محقت بركة بيعهما"

برکت کی حقیقت یہ ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

(1) ملاحظہ ہو سنن ابی داود ٢/٦٣ (١٤٢٥-١٤٢٦) والحديث سكت عنه أبو داود. وقال المنذري في "مختصره" ١/٤٣٩ (١٣٧٨): وأخرجه الترمذي، والنسائي، وابن ماجه، وقال الترمذي: هذا حديث حسن، لا نعرفه إلا من هذا الوجه، من حديث أبي الحوراء السعدي، واسمه ربيعة بن شيبان، ولا يعرف عن النبي ﷺ في القنوت شيئًا أحسن من هذا.

معاملات کی صفائی اور تنازعات

(ذکر و فکر ص ۸۳)
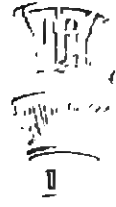
معاملات کی صفائی اور تنازعات

ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب امڈ آیا ہے، اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہوسکتا ہے، لیکن یہ اندازہ یقینا ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، کیونکہ بے شمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ عدالت سے رجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صرفہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رجوع نہیں کرپاتے۔ اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دوسروں کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہ میں اگر دیکھا جائے تو وہی زر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں۔ روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا پرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کرڈالتا ہے اور اس کی وجہ سے بڑی مثالی دوستیاں آن

کی آن میں دشمنیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ایک بہت بڑا سبب ''معاملات'' کو صاف نہ رکھنا ہے، ہمارے دین کی ایک انتہائی زرّیں تعلیم یہ ہے کہ

''آپس میں رہو بھائیوں کی طرح، لیکن لین دین کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''

مطلب یہ ہے کہ روز مرہ کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جیسے ایک بھائی کو دوسرے کے ساتھ کرنا چاہیے، اس میں ایثار، مروت، رواداری، تحمل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو، لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد کے معاملات اور شرکت وحصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح انجام دو، جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں، یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہیے، نہ کوئی بات ابہام میں رہے اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت میں دین کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کرلیا جائے تو بعد میں پیدا ہوانے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سدّ باب ہوجاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اصول کو جس طرح نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

① بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترک طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور کسی حساب کتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے

اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں۔ نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کر رہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے، اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز پیش کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کر لینی چاہیے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں ایک دوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں، بالخصوص جب حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہوجاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے اور مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رو رعایت کا وہی انداز باقی نظر آتا ہے، لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے اور بالآخر جب رنجشیں بدگمانیوں کے ساتھ مل کر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور محبت و اتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ زبانی تو تکار سے لے کر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہوجاتی ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے وہ اس پر قابض ہو کر عدل و انصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدزبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا کرتا ہے کہ الامان!۔

پھر چونکہ سالہا سال تک مشترکہ کاروبار کا نہ کوئی اصول طے شدہ تھا، نہ کوئی

حساب و کتاب رکھا گیا، اس لیے اگر اختلاف پیش آنے کی صورت میں افہام و تفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے، تو معاملات کی ڈور الجھ کر اتنی پیچیدہ ہوچکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیے کے لیے اس کا سرا پکڑنا مشکل ہوجاتا ہے، ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت مشکل ہوجاتا ہے، جو تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

یہ سارا فساد اکثر و بیشتر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں یا اس میں مختلف افراد کی شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا، اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اور کس کے کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہوانے پیچیدگیوں کا شروع ہی میں سد باب ہوجائے۔

قرآنِ کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے [1]، اس میں اللہ تعالی نے تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، جب معمولی رقم ادھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی؟

یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں اور اگر ہوں تو انہیں حق و انصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو۔

لہٰذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کر رہے ہیں تو پہلے ہی

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۸۲)۔

قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کرے گا یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہوگا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کرے گا؟ پہلی صورت میں اس کی تنخواہ متعین ہونی چاہیے اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے اور دوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنانا ہے تو شرعاً اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہیے (جس کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کردے اور وہ اس رقم سے کاروبار کا ایک متعین فی صد حصہ خرید لے)، دوسری یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدہ شرکت کی شکل میں محفوظ کر لینی چاہیے اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونی ضروری ہے کہ نفع میں کتنا فی صد حصہ کس کا ہوگا؟ تاکہ بعد میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو۔

اگر کسی ایک حصے دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہیے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضا کارانہ طور پر کرے گا یا اس کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائے گا، اگر کوئی معاوضہ دیا جائے گا تو وہ نفع کے فی صد حصے میں اضافہ کر کے دیا جائے گا یا متعین تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق وفرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا تو جتنی جلدی ہوسکے ان امور کو طے کر لینا ضروری ہے اوراس معاملے میں کسی شرم، مروت اور طعن وتشنیع کو آڑے نہ آنے دینا چاہیے، معاملات کی اس صفائی کو

محبت و اخوت اور اتحاد و اتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے، بلکہ درحقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان امور پر منحصر ہے، ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے اور اسی لیے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ ''رہو بھائیوں کی طرح، لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''۔

② اسی طرح ہمارے معاشرے میں، بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اس کی خریداری خاندان کے کئی افراد مل کر کرتے ہیں، اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر اور بسا اوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگادی جاتی ہیں، یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر کے لیے دے رہا ہے آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے یا قرض؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لیے یہ رقم خرچ کر رہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا، نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت لینے کا حقدار ہوگا، دوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا، لیکن دی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض سمجھی جائے گی۔ تیسری صورت میں اپنی لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں شریک ہوگا اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں، لیکن چونکہ رقم لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت طے نہیں ہوتی، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے، اس لیے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلاف پیدا ہوجاتے ہیں اور خاص طور پر باپ کے

انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے، تو یہ اختلافات ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کرلیتے ہیں، ان کی وجہ سے بھائیوں میں چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کا خاندان متاثر ہوتا ہے۔

اگر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع میں یہ ساری باتیں طے کرلی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلم بند کرلیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہوجائے۔

③ جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں میں تقسیم کیا جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جارہی ہے۔ بعض اوقات تو جس کے ہاتھ جو لگتا ہے، لے اڑتا ہے اور حلال وحرام ہی کی پرواہ نہیں کی جاتی اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیش نظر بد دیانتی نہیں ہوتی، لیکن ناواقفیت یا لاپروائی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا، لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصوں کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائے گا؟ ترکے میں کون سی چیز کس کے حصے میں آئے گی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دلائے بھی، تو اس کی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑ گئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے اور معاملات کی صفائی کا تقاضہ بھی اور اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ورثاء کو

اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے، رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین و آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی، اس لیے اب معاملات الجھ جاتے ہیں، ان کے مناسب تصفیے میں سخت مشکلات پیدا ہوجاتی ہیں اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آجائے اور باہمی رضا مندی اور اتحاد و اتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پاجائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے اور باہمی محبت و اخوت کو فروغ ملتا ہے۔

یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ اگر معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے، جس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ معاملہ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، صاف ستھرا ہونا چاہیے، اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں، اس سلسلے میں کوئی شرم و حیا اور لحاظ و مروت آڑے نہیں آنی چاہیے، جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط اس طرح طے پاجائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسن سلوک کر سکے، بہتر ہی بہتر ہے اور یہ مطلب ہے اس ارشاد کا کہ ''رہو بھائیوں کی طرح اور معاملات اجنبیوں کی طرح کرو''۔

۱۳/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ
۲۵/ اپریل ۱۹۹۴ء
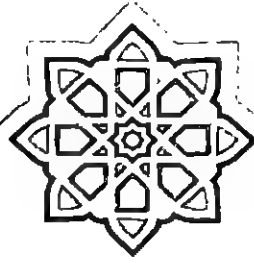
اپنے معاملات صاف رکھیں

(اصلاحی خطبات ۹/ ۷۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنے معاملات صاف رکھیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (۱)

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۲۹)۔

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

معاملات کی صفائی دین کا اہم رکن

یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے یہ دین کے ایک بہت اہم رکن سے متعلق ہے، وہ دین کا اہم رکن ''معاملات کی درستی اور اس کی صفائی'' ہے، یعنی انسان کا معاملات میں اچھا ہونا اور خوش معاملہ ہونا، یہ دین کا بہت اہم باب ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ دین کا جتنا اہم باب ہے ہم لوگوں نے اتنا ہی اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رکھا ہے۔ ہم نے دین کو صرف چند عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، عمرہ، وظائف اور اوراد میں منحصر کرلیا ہے، لیکن روپے پیسے کے لین دین کا جو باب ہے اس کو ہم نے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے، گویا کہ دین سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ اسلامی شریعت کے احکام کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے کہ عبادات سے متعلق جو احکام ہیں وہ ایک چوتھائی ہیں اور تین چوتھائی احکام معاملات اور معاشرت سے متعلق ہیں۔

تین چوتھائی دین معاملات میں ہے

فقہ کی ایک مشہور کتاب ہے جو ہمارے تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ عالم بنتے ہیں، اس کا نام ہے ''ہدایہ''۔ اس کتاب میں طہارت سے لے کر میراث تک شریعت کے جتنے احکام ہیں وہ سب اس کتاب میں جمع ہیں، اس کتاب کی چار جلدیں ہیں۔ پہلی جلد عبادات سے متعلق

ہے جس میں طہارت کے احکام، نماز کے احکام، زکوۃ روزے اور حج کے احکام بیان کیے گئے ہیں اور باقی تین جلدیں معاملات یا معاشرت کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ دین کے احکام کا ایک چوتھائی حصہ عبادات سے متعلق ہے اور تین چوتھائی حصہ معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کی خرابی کا عبادات پر اثر

پھر اللہ تعالیٰ نے ان معاملات کا یہ مقام رکھا ہے کہ اگر انسان روپے پیسے کے معاملات میں حلال وحرام کا اور جائز و ناجائز کا امتیاز نہ رکھے تو عبادات پر بھی اس کا اثر یہ واقع ہوتا ہے کہ چاہے وہ عبادات ادا ہوجائیں، لیکن ان کا اجروثواب اور ان کی قبولیت موقوف ہوجاتی ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عاجزی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں، اس حال میں کہ ان کے بال بکھرے ہوئے ہیں، گڑگڑا کر اور رو رو کر پکارتے ہیں کہ یا اللہ! میرا یہ مقصد پورا کر دیجیے، فلاں مقصد پورا کر دیجیے، بڑی عاجزی سے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعائیں کر رہے ہوتے ہیں، لیکن کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام اور ان کا جسم حرام آمدنی سے پرورش پایا ہوا، فأنی یستجاب له الدعاء، ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہو؟ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔[1]

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۷۰۳ (۱۰۱۵)۔

معاملات کی تلافی بہت مشکل ہے

دوسری جتنی عبادات ہیں اگر ان میں کوتاہی ہوجائے تو اس کی تلافی آسان ہے۔ مثلاً نمازیں چھوٹ گئیں تو اب اپنی زندگی میں قضا نمازیں ادا کرلو اور اگر زندگی میں ادا نہ کرسکے تو وصیت کرجاؤ کہ اگر میں مرجاؤں اور میری نمازیں ادا نہ ہوئی ہوں تو میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کردیا جائے اور توبہ کرلو، ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تلافی ہوجائے گی، لیکن اگر کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر کھالیا تو اس کی تلافی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، چاہے تم ہزار توبہ کرتے رہو، ہزار نفلیں پڑھتے رہو۔ اس لیے معاملات کا باب بہت اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور معاملات

اسی وجہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف اور طریقت کی تعلیمات میں معاملات کو سب سے زیادہ اولیت حاصل تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اپنے مریدین میں سے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ اس نے اپنے معمولات، نوافل اور اوراد و وظائف پورے نہیں کیے تو اس کی وجہ سے رنج ہوتا ہے اور اس مرید سے کہہ دیتا ہوں کہ ان کو پورا کرلو، لیکن اگر کسی مرید کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ اس نے روپے پیسے کے معاملات میں گڑبڑ کی ہے تو مجھے اس مرید سے نفرت ہوجاتی ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے جن کو آپ نے خلافت عطا فرمادی تھی اور ان کو بیعت اور تلقین کرنے کی اجازت دے دی تھی، ایک مرتبہ وہ سفر کر کے حضرت والا کی خدمت میں تشریف لائے، ان کے ساتھ ان کا بچہ بھی تھا، انہوں نے آکر سلام کیا اور ملاقات کی اور بچے کو بھی ملوایا کہ حضرت یہ میرا بچہ ہے، اس کے لیے دعا فرمادیجیے، حضرت والا نے بچے کے لیے دعا فرمائی اور پھر ویسے ہی پوچھ لیا کہ اس بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت اس کی عمر ۱۳ سال ہے۔ حضرت نے پوچھا کہ آپ نے ریل گاڑی کا سفر کیا ہے تو اس بچے کا آدھا ٹکٹ لیا تھا یا پورا ٹکٹ لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت آدھا ٹکٹ لیا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ نے آدھا ٹکٹ کیسے لیا جب کہ بارہ سال سے زائد عمر کے بچے کا تو پورا ٹکٹ لگتا ہے، انہوں نے عرض کیا کہ قانون تو یہی ہے کہ بارہ سال کے بعد ٹکٹ پورا لینا چاہیے اور یہ بچہ اگرچہ ۱۳ سال کا ہے، لیکن دیکھنے میں ۱۲ سال کا لگتا ہے، اس وجہ سے میں نے آدھا ٹکٹ لیا۔ حضرت نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تصوف اور طریقت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ آپ کو ابھی تک اس بات کا احساس اور ادراک نہیں کہ بچے کو جو سفر آپ نے کرایا یہ حرام کرایا۔ جب قانون یہ ہے کہ ۱۲ سال سے زائد عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لگتا ہے اور آپ نے آدھا ٹکٹ لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ریلوے کے آدھے ٹکٹ کے پیسے غصب کر لیے اور آپ نے چوری کی اور جو شخص چوری اور غصب کرے ایسا شخص تصوف اور طریقت میں کوئی مقام نہیں رکھتا، لہٰذا آج سے آپ کی خلافت اور بیعت واپس لی جاتی ہے، چنانچہ اس بات

پر ان کی خلافت سلب کرلی، حالانکہ اپنے اوراد و وظائف میں، عبادات اور نوافل میں، تہجد اور اشراق میں، ان میں سے ہر چیز میں بالکل اپنے طریقے پر مکمل تھے، لیکن یہ غلطی کی کہ بچے کا ٹکٹ پورا نہیں لیا، صرف اس غلطی کی بناء پر خلافت سلب کرلی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اپنے سارے مریدین اور متعلقین کو یہ ہدایت تھی کہ جب کبھی ریلوے میں سفر کرو اور تمہارا سامان اس مقدار سے زائد ہو جتنا ریلوے نے تمہیں مفت لے جانے کی اجازت دی ہے، تو اس صورت میں اپنے سامان کا وزن کراؤ اور زائد سامان کا کرایہ ادا کرو، پھر سفر کرو۔ خود حضرت والا کا اپنا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سفر کے ارادے سے اسٹیشن پہنچے، گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، آپ اپنا سامان لے کر اس دفتر میں پہنچے، جہاں پر سامان کا وزن کرایا جاتا تھا اور جا کر لائن میں لگ گئے۔ اتفاق سے گاڑی میں ساتھ جانے والا گارڈ وہاں آگیا، اور حضرت والا کو دیکھ کر پہچان لیا اور پوچھا کہ حضرت آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ میں سامان کا وزن کرانے آیا ہوں۔ گارڈ نے کہا کہ آپ کو سامان کا وزن کرانے کی ضرورت نہیں، آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کے ساتھ گاڑی میں جارہا ہوں، آپ کو زائد سامان کا کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے؟ گارڈ نے کہا کہ میں فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت نے پوچھا کہ اس اسٹیشن کے بعد کیا ہوگا؟ گارڈ نے کہا کہ اس اسٹیشن پر دوسرا گارڈ آئے گا میں اس کو بتا دوں گا کہ یہ حضرت کا سامان ہے اس کے بارے میں کچھ

پوچھ گچھ مت کرنا۔ حضرت نے پوچھا وہ گارڈ میرے ساتھ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے کہا وہ تو اور آگے جائے گا۔ اس سے پہلے ہی آپ کا اسٹیشن آجائے گا، حضرت نے فرمایا کہ میں تو اور آگے جاؤں گا، یعنی آخرت کی طرف جاؤں گا اور اپنی قبر میں جاؤں گا وہاں پر کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا؟ جب وہاں آخرت میں مجھ سے سوال ہوگا کہ ایک سرکاری گاڑی میں سامان کا کرایہ ادا کیے بغیر جو سفر کیا اور جو چوری کی اس کا حساب دو، تو وہاں پر کون سا گارڈ میری مدد کرے گا؟

معاملات کی خرابی سے زندگی حرام

چنانچہ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ جب کوئی شخص ریلوے کے دفتر میں اپنے سامان کا وزن کرا رہا ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ یہ شخص تھانہ بھون جانے والا ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے ہے۔ حضرت والا کی بہت سی باتیں لوگوں نے لے کر مشہور کردیں، لیکن آج یہ پہلو کہ ایک پیسہ بھی شریعت کے خلاف کسی ذریعے سے ہمارے پاس نہ آئے یہ پہلو نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ آج کتنے لوگ اس قسم کے معاملات کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم یہ معاملات شریعت کے خلاف اور ناجائز کر رہے ہیں، اگر ہم نے غلط کام کرکے چند پیسے بچالیے تو وہ چند پیسے حرام ہوگئے اور وہ حرام ہمارے دوسرے مال کے ساتھ ملنے کے نتیجے میں اس کے بُرے اثرات ہمارے مال میں پھیل گئے، پھر اسی مال سے ہم کھانا کھا رہے ہیں، اسی سے کپڑا بنا رہے ہیں، اسی سے لباس تیار ہو رہا ہے، جس کے نتیجے میں ہماری پوری زندگی حرام ہو رہی ہے اور ہم چونکہ بے حس ہوگئے ہیں اس لیے حرام مال اور حرام آمدنی کے برے نتائج کا

ہمیں ادراک بھی نہیں۔ یہ حرام مال ہماری زندگی میں کیا فساد مچا رہا ہے اس کا ہمیں احساس نہیں، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ احساس عطا فرماتے ہیں ان کو پتہ لگتا ہے کہ حرام چیز کیا ہوتی ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چند لقمے کھانا

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر استاد تھے اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک دعوت میں چلا گیا اور وہاں جا کر کھانا کھا لیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کی آمدنی مشکوک ہے۔ فرماتے ہیں کہ مہینوں تک ان چند لقموں کی ظلمت اپنے دل میں محسوس کرتا رہا اور مہینوں تک میرے دل میں گناہ کرنے کے جذبات پیدا ہوتے رہے اور طبیعت میں یہ داعیہ بار بار پیدا ہوتا تھا کہ فلاں گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں۔ حرام مال سے یہ ظلمت پیدا ہوجاتی ہے۔

حرام کی دو قسمیں

یہ جو آج ہمارے دلوں سے گناہوں کی نفرت مٹتی جارہی ہے اور گناہ کے گناہ ہونے کا احساس ختم ہورہا ہے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے مال میں حرام کی ملاوٹ ہوچکی ہے۔ پھر ایک تو وہ حرام ہے جو کھلا حرام ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے جیسے رشوت کا مال، سود کا مال، جوا کا مال، دھوکے کا مال، چوری کا مال وغیرہ، لیکن حرام کی دوسری قسم وہ حرام ہے جس کے حرام ہونے کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے، حالانکہ وہ بھی حرام ہے اور وہ حرام چیز ہمارے کاروبار میں مل رہی ہے، اس دوسری قسم کی تفصیل سنیے۔

ملک متعین ہونی چاہیے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ معاملات چاہے بھائیوں کے درمیان ہوں، باپ بیٹے کے درمیان ہوں، شوہر اور بیوی کے درمیان ہوں وہ معاملات بالکل صاف اور بے غبار ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی غبار نہ ہونا چاہیے اور ملکیتیں آپس میں متعین ہونی چاہئیں کہ کون سی چیز باپ کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیٹے کی ملکیت ہے، کون سی چیز شوہر کی ملکیت ہے اور کون سی چیز بیوی کی ملکیت ہے، کون سی چیز ایک بھائی کی ہے اور کون سی چیز دوسرے بھائی کی ہے، یہ ساری بات واضح اور صاف ہونی چاہیے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، چنانچہ فرمایا گیا:

"تعاشروا کالإخوان، تعاملوا کالأجانب"(۱)

یعنی بھائیوں کی طرح رہو، لیکن آپس کے معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔

مثلاً اگر قرض کا لین دین کیا جا رہا ہے تو اس کو لکھ لو کہ یہ قرض کا معاملہ ہے، اتنے دن کے بعد اس کی واپسی ہوگی۔

باپ بیٹوں کے مشترک کاروبار

آج ہمارا سارا معاشرہ اس بات سے بھرا ہوا ہے کہ کوئی بات صاف ہی نہیں، اگر باپ بیٹوں کے درمیان کاروبار ہے تو وہ کاروبار ویسے ہی چل رہا ہے،

---

(۱) الامثال المولدة لابی بکر محمد بن العباس الخوارزمی ص ۳۱۴ طبع عالم النشر۔

اس کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی کہ بیٹے باپ کے ساتھ جو کام کر رہے ہیں وہ آیا شریک کی حیثیت میں کر رہے ہیں یا ملازم کی حیثیت میں کر رہے ہیں یا ویسے ہی باپ کی مفت مدد کر رہے ہیں، اس کا کچھ پتہ نہیں، مگر تجارت ہو رہی ہے، ملیں قائم ہو رہی ہیں، دکانیں بڑھتی جا رہی ہیں، مال اور جائیداد بڑھتا جا رہا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں کہ کس کا کتنا حصہ ہے۔ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اپنے معاملات کو صاف کرو تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو غیریت کی بات ہے، بھائیوں بھائیوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ یا باپ بیٹوں میں صفائی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب شادیاں ہو جاتی ہیں اور بچے ہو جاتے ہیں اور شادی میں کسی نے زیادہ خرچ کر لیا اور کسی نے کم خرچ کیا یا ایک بھائی نے مکان بنا لیا اور دوسرے نے ابھی تک مکان نہیں بنایا بس اب دل میں شکایتیں اور ایک دوسرے کی طرف سے کینہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اب آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں زیادہ کھا گیا اور مجھے کم ملا اور اگر اس دوران باپ کا انتقال ہو جائے تو اس کے بعد بھائیوں کے درمیان جو لڑائی اور جھگڑے ہوتے ہیں وہ لامتناہی ہوتے ہیں، پھر ان کے حل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

باپ کے انتقال پر میراث کی فوراً تقسیم کریں

جب باپ کا انتقال ہو جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ فوراً میراث تقسیم کردو۔ میراث تقسیم کرنے میں تاخیر کرنا حرام ہے، لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ باپ کے انتقال پر میراث تقسیم نہیں ہوتی اور جو بڑا بیٹا ہے وہ کاروبار پر قابض ہو جاتا ہے اور بیٹیاں خاموش بیٹھی رہتی ہیں، ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہاں تک کہ اسی حالت میں دس سال اور بیس سال

گزر گئے اور پھر اسی دوران کسی اور کا بھی انتقال ہوگیا یا کسی بھائی نے اس کاروبار میں اپنا پیسہ ملادیا، پھر سالہا سال گزرنے کے بعد جب ان کی اولاد بڑی ہوئی تو اب جھگڑے کھڑے ہوگئے اور جھگڑے ایسے وقت میں کھڑے ہوئے جب ڈور الجھی ہوئی ہے اور جب جھگڑے انتہا کی حد تک پہنچے تو اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ اب آپ بتائیں ہم کیا کریں؟ مفتی صاحب بے چارے ایسے وقت میں کیا کریں گے؟ اب اس وقت یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ جس وقت کاروبار کے اندر شرکت تھی اور بیٹے اپنے باپ کے ساتھ مل کر کاروبار کررہے تھے اس وقت بیٹے کس حیثیت میں کام کررہے تھے؟

مشترک مکان کی تعمیر میں حصے داروں کا حصہ

یا مثلاً ایک مکان بن رہا ہے، تعمیر کے دوران کچھ پیسے باپ نے لگا دیے، کچھ پیسے ایک بیٹے نے لگادیے، کچھ دوسرے بیٹے نے لگا دیے، کچھ تیسرے نے لگادیے، لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون کس حساب سے کس طرح سے کس تناسب سے لگارہا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں کہ جو پیسے تم لگا رہے ہو وہ آیا بطور قرض کے دے رہے ہو اور اس کو واپس لوگے یا مکان میں حصہ دار بن رہے ہو یا بطور امداد اور تعاون کے پیسے دے رہے ہو، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ اب مکان تیار ہوگیا اور اس میں رہنا شروع کردیا، اب جب باپ کا انتقال ہوا یا آپس میں دوسرے مسائل پیدا ہوئے تو اب مکان پر جھگڑے کھڑے ہوگئے، اب مفتی صاحب کے پاس چلے آرہے ہیں کہ فلاں بھائی یہ کہتا ہے کہ میرا اتنا حصہ ہے، مجھے اتنا ملنا چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ مجھے اتنا ملنا چاہیے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی! جب تم نے اس مکان کی تعمیر میں پیسے دیے تھے اس وقت تمہاری نیت کیا

تھی؟ کیا تم نے بطور قرض دیے تھے؟ یا تم مکان میں حصہ دار بننا چاہتے تھے؟ یا باپ کی مدد کرنا چاہتے تھے؟ اس وقت کیا بات تھی؟ تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم نے تو پیسے دیتے وقت کچھ سوچا ہی نہیں تھا، نہ تو ہم نے مدد کے بارے میں سوچا تھا اور نہ حصے داری کے بارے میں سوچا تھا، اب آپ کوئی حل نکالیں۔ جب ڈور الجھ گئی اور سِرا ہاتھ نہیں آرہا ہے تو اب مفتی صاحب کی مصیبت آئی کہ وہ اس کا حل نکالیں کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ معاملات کے بارے میں حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل نہیں کیا، نفلیں ہورہی ہیں، تہجد کی نماز ہورہی ہے، اشراق کی نماز ہورہی ہے، لیکن معاملات میں سب الم غلم ہورہا ہے، کسی چیز کا کچھ پتہ نہیں، یہ سب کام حرام ہورہا ہے، جب یہ معلوم نہیں کہ میرا کتنا حق ہے اور دوسرے کا کتنا حق ہے تو اس صورت میں جو کچھ تم اس میں سے کھا رہے ہو اس کے حلال ہونے میں شبہ ہے، جائز نہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ملکیت کی وضاحت

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ اُن کا ایک مخصوص کمرہ تھا، اس میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک چار پائی بچھی ہوئی تھی، اسی پر آرام کیا کرتے تھے، اسی پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتے تھے، وہیں پر لوگ آکر ملاقات کیا کرتے تھے، میں یہ دیکھتا تھا کہ جب اس کمرے میں کوئی سامان باہر سے آتا تو فوراً واپس بھجوادیتے تھے۔ مثلاً حضرت والد صاحب نے پانی منگوایا میں گلاس میں پانی بھر کر پلانے چلا گیا۔ جب آپ پانی پی لیتے تو فوراً فرماتے کہ یہ گلاس واپس رکھ آؤ جہاں سے لائے تھے، جب گلاس واپس لے جانے میں دیر ہوجاتی تو

ناراض ہوجاتے، اگر پلیٹ آجاتی تو فوراً فرماتے کہ یہ پلیٹ واپس باورچی خانے میں رکھ آؤ۔ ایک دن میں نے کہا کہ حضرت! اگر سامان واپس لے جانے میں تھوڑی دیر ہوجایا کرے تو معاف فرمادیا کریں۔ فرمانے لگے کہ تم بات سمجھتے نہیں ہو، بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامہ میں لکھا ہوا کہ اس کمرے میں جو سامان بھی ہے وہ میری ملکیت ہے اور باقی کمروں میں اور گھر میں جو سامان ہے وہ تمہاری والدہ کی ملکیت ہے۔ اس لیے میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کبھی دوسرے کمروں کا سامان یہاں پر آجائے اور اسی حالت میں میرا انتقال ہوجائے تو اس وصیت نامہ کے مطابق تم یہ سمجھوگے کہ یہ میری ملکیت ہے، حالانکہ وہ میری ملکیت نہیں، اس وجہ سے میں کوئی چیز دوسروں کی اپنے کمرے میں نہیں رکھتا، واپس کروا دیتا ہوں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط

جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوگئی تو میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ حضرت والد صاحب سے حضرت ڈاکٹر صاحب کو بہت ہی والہانہ تعلق تھا جس کا ہم اور آپ تصوّر نہیں کرسکتے۔ چونکہ آپ ضعیف تھے، اس وجہ سے اس وقت آپ پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے اس وقت خیال آیا کہ حضرت والا پر اس وقت بہت ضعف اور غم ہے تو اندر سے میں حضرت والد صاحبؒ کا خمیرہ لے آیا جو آپ تناول فرمایا کرتے تھے اور حضرت والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ خمیرہ کا ایک چمچہ تناول فرمالیں حضرت والا نے اس خمیرہ کو دیکھتے ہی

کہا کہ تم یہ خمیرہ کیسے لے آئے ہو، یہ خمیرہ تو اب میراث کا اور ترکہ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اب تمہارے لیے جائز نہیں کہ اس طرح یہ خمیرہ اٹھا کر کسی کو دے دو، اگرچہ وہ ایک چمچہ کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے کہا کہ حضرت! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے ورثاء ہیں وہ سب الحمد للہ بالغ ہیں اور وہ سب یہاں موجود ہیں اور سب اس بات پر راضی ہیں کہ آپ یہ خمیرہ تناول فرمالیں۔ تب حضرت نے وہ خمیرہ تناول فرمایا۔

حساب اسی دن کرلیں

اس کے ذریعے حضرت والا نے یہ سبق دے دیا کہ یہ بات ایسی بات نہیں ہے کہ آدمی رواداری میں گزر جائے۔ فرض کریں کہ اگر تمام ورثاء میں ایک وارث بھی نابالغ ہوتا یا موجود نہ ہوتا اور اس کی رضامندی شامل نہ ہوتی تو اس خمیرے کا ایک چمچہ بھی حرام ہوجاتا۔ اس لیے شریعت کا یہ حکم ہے کہ جونہی کسی کا انتقال ہوجائے تو جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کردو یا کم از کم حساب کر کے رکھ لو کہ فلاں کا اتنا حصہ ہے اور فلاں کا اتنا حصہ ہے، اس لیے کہ بعض اوقات تقسیم میں کچھ تاخیر ہوجاتی ہے، بعض اشیاء کی قیمت لگانی پڑتی ہے اور بعض اشیاء کو فروخت کرنا پڑتا ہے، لیکن حساب اسی دن ہونا چاہیے۔ آج اس وقت ہمارے معاشرے میں جتنے جھگڑے پھیلے ہوئے ہیں ان جھگڑوں کا ایک بڑا بنیادی سبب حساب کتاب کا صاف نہ ہونا اور معاملات کا صاف نہ ہونا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور تصوف پر کتاب

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں

نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے فقہی احکام اپنی تصانیف کے ذریعے ہم تک پہنچائے، ان کا احسان ہمارے سروں پر اتنا ہے کہ ساری عمر تک ہم ان کے احسان کا صلہ نہیں دے سکتے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں، لیکن تصوف اور زہد کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا: تم کیسے کہتے ہو کہ میں نے تصوف پر کتاب نہیں لکھی، میں نے جو ''کتاب البیوع'' لکھی ہے وہ تصوف ہی کی تو کتاب ہے۔[1]

مطلب یہ تھا کہ خرید وفروخت کے احکام اور لین دین کے احکام حقیقت میں تصوف ہی کے احکام ہیں، اس لیے کہ زہد اور تصوف درحقیقت شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی کا نام ہے اور شریعت کی ٹھیک ٹھیک پیروی خرید وفروخت اور لین دین کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔

دوسروں کی چیز اپنے استعمال میں لانا

اسی طرح دوسرے کی چیز استعمال کرنا حرام ہے۔ مثلاً کوئی دوست ہے یا بھائی ہے اس کی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرلی تو یہ جائز نہیں، بلکہ حرام ہے، البتہ اگر آپ کو یقین ہے کہ اس کی چیز استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اور خوشی سے اس کی اجازت دے دے گا تب تو استعمال کرنا جائز ہے، لیکن جہاں ذرا بھی اس کی اجازت میں شک ہو، چاہے وہ حقیقی بھائی ہی کیوں نہ ہو یا چاہے وہ بیٹا ہو اور اپنے باپ کی چیز استعمال کر رہا ہو جب تک اس بات کا

---

(۱) المبسوط للسرخسی ۱۲/۱۱۰ طبع دار المعرفة۔

اطمینان نہ ہو کہ خوش دلی سے وہ اجازت دے دے گا یا میرے استعمال کرنے سے وہ خوش ہوگا اس وقت تک اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه"[1]

کسی مسلمان کا مال تمہارے لیے حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے نہ دے۔ اس حدیث میں "اجازت" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، بلکہ "خوش دلی" کا لفظ استعمال فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اجازت کافی نہیں، بلکہ وہ اس طرح اجازت دے کہ اس کا دل خوش ہو تب وہ چیز حلال ہے۔ اگر آپ دوسرے کی چیز استعمال کر رہے ہیں، لیکن آپ کو اس کی خوش دلی کا یقین نہیں ہے تو آپ کے لیے وہ چیز استعمال کرنا جائز نہیں۔

ایسا چندہ حلال نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسوں کے چندوں اور انجمنوں کے چندے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ چندے اس طرح وصول کرنا کہ دوسرا شخص دباؤ کے تحت چندہ دے، ایسا چندہ حلال نہیں۔ مثلاً آپ نے مجمع عام میں چندہ لینا شروع کر دیا، اس مجمع میں ایک آدمی شرما شرمی میں یہ سوچ کر چندہ دے رہا ہے کہ اتنے سارے لوگ چندہ دے رہے ہیں اور میں چندہ نہ دوں تو میری ناک کٹ جائے گی اور دل کے اندر چندہ دینے کی خواہش نہیں تھی تو یہ

---

(۱) مسند ابی یعلی ۳/ ۱۴۰ (۱۵۷۰) وقال الهيثمي في "المجمع" ۴/ ۳۰۵ (۶۸۶۶): رواه أبو يعلى، وأبو حرة وثقه أبو داود، وضعفه ابن معين.

چندہ خوش دلی کے بغیر دیا گیا، یہ ''چندہ'' لینے والے کے لیے حلال نہیں۔ اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ احکام لکھے ہیں کہ کس حالت میں چندہ لینا جائز ہے اور کس حالت میں چندہ لینا جائز نہیں۔

ہر ایک کی ملکیت واضح ہونی چاہیے

بہرحال! یہ اصول ذہن میں رکھو کہ جب تک دوسرے کی خوش دلی کا اطمینان نہ ہو اس وقت تک دوسرے کی چیز استعمال کرنا حلال نہیں، چاہے وہ بیٹا کیوں نہ ہو، باپ کیوں نہ ہو، بھائی اور بہن کیوں نہ ہو، چاہے بیوی اور شوہر کیوں نہ ہو، اس اصول کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہمارے مال میں حرام کی آمیزش ہوجاتی ہے، اگر کوئی شخص کہے کہ میں تو کوئی غلط کام نہیں کرتا، رشوت میں نہیں لیتا، سود نہیں کھاتا، چوری میں نہیں کرتا، ڈاکہ میں نہیں ڈالتا اس لیے میرا مال تو حلال ہے، لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ اس اصول کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے مال حرام کی آمیزش ہوجاتی ہے اور مال حرام کی آمیزش حلال مال کو بھی تباہ کردیتی ہے اور اس کی برکتیں زائل ہوجاتی ہیں، اس کا نفع ختم ہوجاتا ہے اور الٹا اس حرام مال کے نتیجے میں انسان کی طبیعت گناہوں کی طرف چلتی ہے، روحانیت کو نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے معاملات کو صاف کرنے کی فکر کریں کہ کسی معاملے میں کوئی الجھاؤ نہ رہے، ہر چیز صاف اور واضح ہونی چاہیے، ہر چیز کی ملکیت واضح ہونی چاہیے کہ یہ چیز میری ملکیت ہے، یہ فلاں کی ملکیت ہے، البتہ ملکیت واضح ہونے کے بعد آپس میں بھائیوں کی طرح رہو، دوسرے شخص کو تمہاری چیز استعمال کرنے کی نوبت آئے تو دے دو، لیکن ملکیت واضح ہونی چاہیے، تاکہ کل کو کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

مسجدِ نبوی کے لیے زمین مفت قبول نہ کی

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پیشِ نظر سب سے پہلا کام یہ تھا کہ یہاں پر کوئی مسجد بنائی جائے۔ وہ مسجدِ نبوی جس میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ چنانچہ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آگئی جو خالی پڑی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ کے بارے میں معلوم کرایا کہ یہ کس کی جگہ ہے تو پتہ چلا کہ یہ بنی نجار کے لوگوں کی جگہ ہے۔ جب بنونجار کے لوگوں کو پتہ چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو ہماری بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہماری جگہ پر مسجد بنائی جائے، ہم یہ جگہ مسجد کے لیے مفت دیتے ہیں تاکہ آپ یہاں پر مسجدِ نبوی کی تعمیر فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں مفت نہیں لوں گا، تم اس کی قیمت بتاؤ، قیمت کے ذریعے لوں گا، حالانکہ بظاہر یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی سعادت اور خوش نصیبی سمجھ کر یہ چاہ رہے تھے کہ ان کی جگہ مسجدِ نبوی کی تعمیر میں استعمال ہو جائے، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفت لینا گوارہ نہیں کیا۔ (۱)

تعمیرِ مسجد کے لیے دباؤ ڈالنا

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ ویسے تو جب بنی نجار کے لوگ مسجد کے لیے چندہ کے طور پر مفت زمین دے رہے تھے تو یہ زمین لینا جائز تھا، اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں تھی، لیکن چونکہ مدینہ منورہ میں اسلام کی

(۱) صحیح البخاری ۹۳/۱(۴۲۸)و۶۷/۵(۳۹۳۲)وراجع للتفصیل فتح الباری لابن حجر ۲۴۶/۱.

یہ پہلی مسجد تعمیر ہو رہی تھی، اگرچہ قبا میں ایک مسجد تعمیر ہو چکی تھی، لیکن یہ مسجد تعمیر ہو رہی تھی جس کو آئندہ حرمِ مکہ کے بعد دوسرا مقام حاصل ہونا تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ یہ زمین اس طرح مفت قیمت کے بغیر لے لی جائے، ورنہ آئندہ کے لیے لوگوں کے سامنے یہ نظیر بن جائے گی کہ جب مسجد بنانی ہو تو مسجد کے لیے زمین قیمتاً خریدنے کے بجائے لوگ مفت اپنی زمینیں دیں اور اس لیے یہ زمین مفت قبول نہیں کی تاکہ لوگوں پر یہ واضح فرمادیں کہ یہ بات درست نہیں کہ مسجد کی تعمیر کی خاطر دوسروں پر دباؤ ڈالا جائے یا دوسروں کی املاک پر نظر رکھی جائے۔ اس وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیسے دے کر وہ زمین خریدی اور پھر مسجدِ نبوی کی تعمیر فرمائی تاکہ معاملہ صاف رہے اور کسی قسم کی کوئی الجھن برقرار نہ رہے۔

پورے سال کا نفقہ دینا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن جو حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریکِ حیات بننے کی وہی مستحق تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت نکالی ہوئی تھی اور آخرت کی محبت ان کے دلوں میں بھری ہوئی تھی، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ سال کے شروع میں اپنی تمام ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا نفقہ اکٹھا دے دیا کرتے تھے اور ان سے فرمادیتے کہ یہ تمہارا نفقہ ہے تم جو چاہو کرو۔[1] اب وہ ازواجِ مطہرات بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات تھیں، ان کے یہاں تو ہر وقت صدقہ خیرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، چنانچہ وہ ازواجِ مطہرات بقدرِ ضرورت اپنے پاس رکھتیں، باقی سب خیرات

---

(۱) صحیح البخاری ۱۰۴/۳ (۲۳۲۸) وصحیح مسلم ۱۸۶/۳ (۱۵۵۱).

کر دیتی تھیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مثال قائم فرمائی کہ پورے سال کا نفقہ اکٹھا دے دیا۔

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے برابری کا معاملہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پابندی اٹھالی تھی کہ وہ اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں برابری کریں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار دیا تھا کہ جس کو چاہیں زیادہ دیں اور جس کو چاہیں کم دیں، اس معاملے میں ہم آپ سے مواخذہ نہیں کریں گے[1]۔ اس اختیار کے نتیجے میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے درمیان برابری کرنا آپ کے ذمے فرض نہیں رہا تھا، جبکہ امت کے تمام افراد کے لیے برابری کرنا فرض ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر اس اختیار اور اجازت پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ ہر چیز میں برابری فرمائی اور ان کی ملکیت کو واضح اور نمایاں فرمادیا تھا اور ان کے حقوق پوری طرح زندگی بھر ادا فرمائے۔

خلاصہ

بہرحال! ان احادیث اور آیات میں جو بنیادی اصول بیان فرمایا، جس کو ہم فراموش کرتے جارہے ہیں وہ ''معاملات کی صفائی'' اور معاملات کی درستی ہے یعنی معاملہ صاف اور واضح ہو، اس میں کوئی اجمال اور ابہام نہ رہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک اپنے معاملات کو صاف رکھے، اس کے بغیر آمدنی اور اخراجات شریعت کی حدود میں نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے

---

[1] البحر الرائق لابن نجیم ۲۳۶/۳، طبع دار الکتاب.

فضل وکرم سے اس حقیقت اور اس حکم کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

واخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین
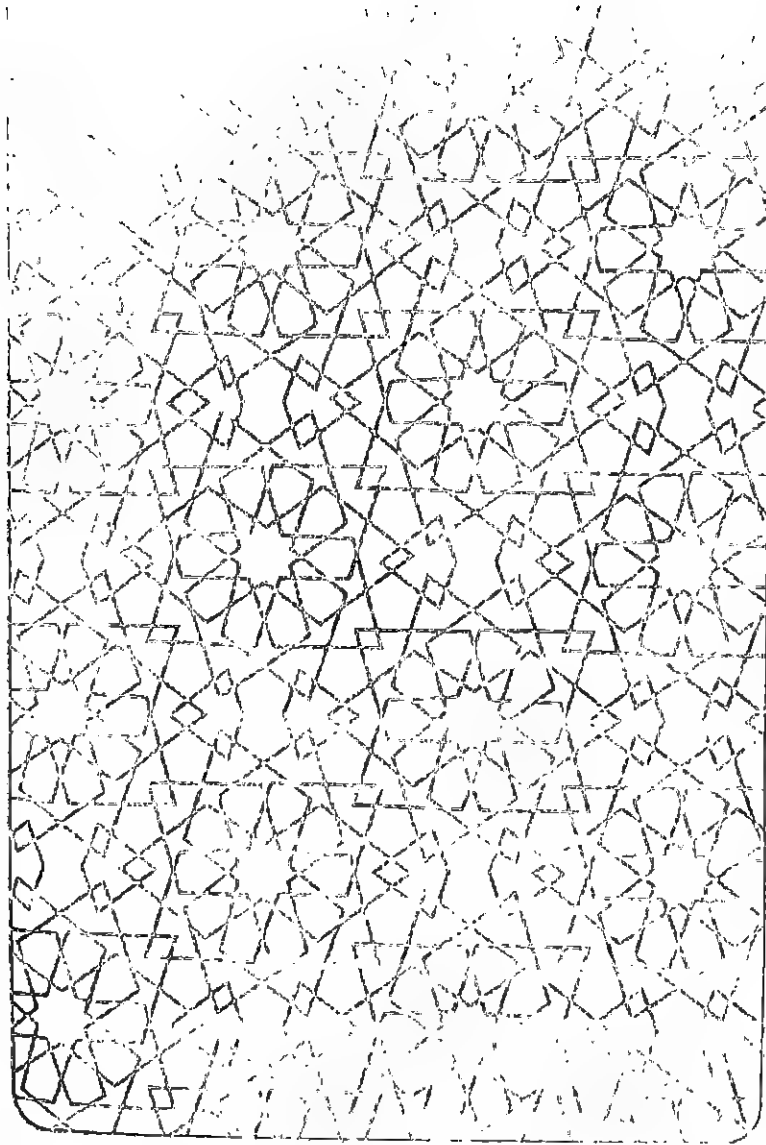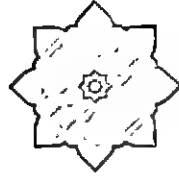
اسلامی بینکنگ کا مختصر تعارف

(خطبات دورۂ ہند ص ۵۹)
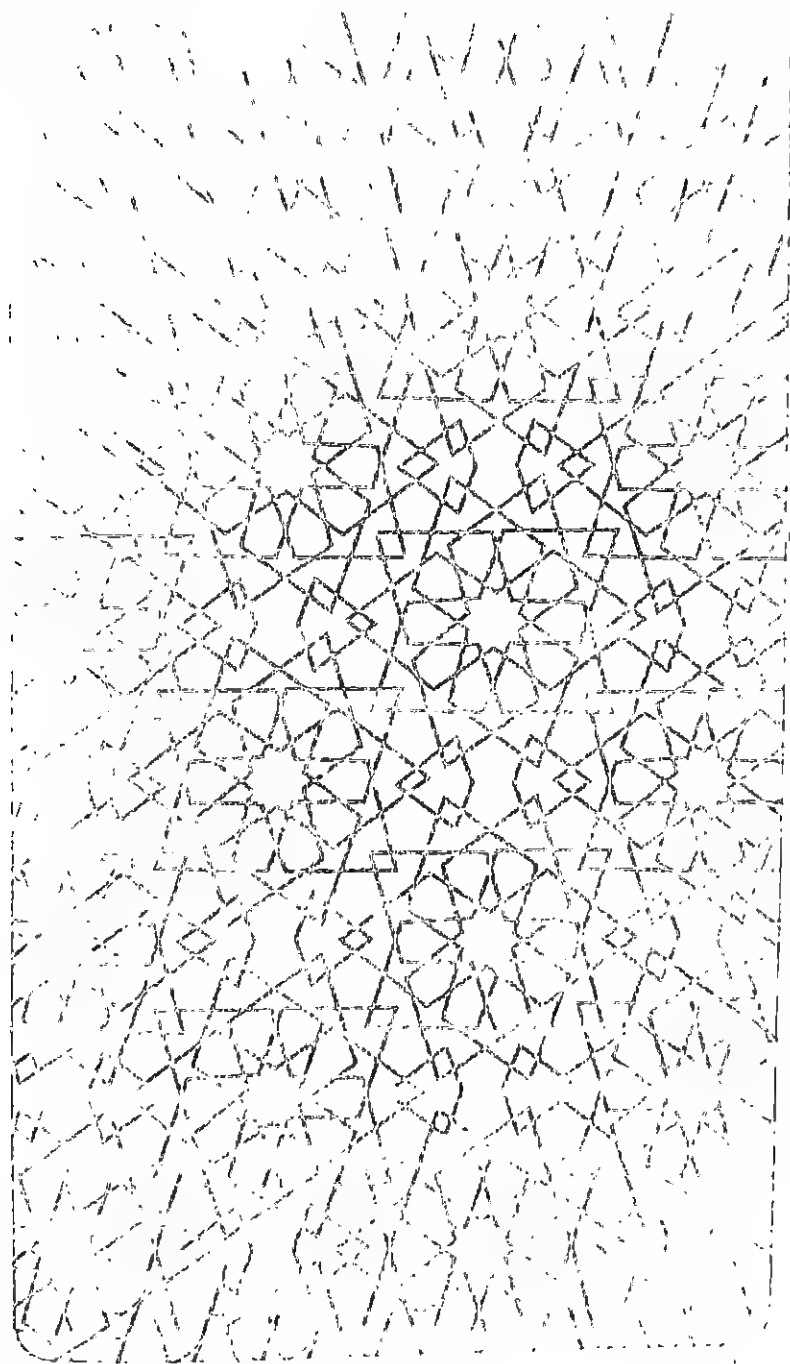
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامک بینکنگ کا مختصر تعارف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

میرے عزیز بھائیو اور معزز حاضرین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہید

یقیناً میرے لیے یہ باعثِ اعزاز اور شرف ہے کہ میں آپ کے درمیان حاضر ہوں تاکہ آپ لوگوں سے ایک بہت ہی اہم موضوع پر گفتگو کرسکوں، جو ہماری اقتصادی زندگی کا انتہائی اہم موضوع ہے۔ بہرحال! سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کے اس حصے (یعنی ہندوستان) میں پہنچایا۔ میں ہندوستان میں پیدا ہوا اور اپنی کم سنی کی عمر میں اپنے والدین کے

ساتھ پاکستان چلا گیا تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے دل سے اس جگہ کی محبت ابھی تک ختم نہیں ہوئی اور میری شدید خواہش رہی ہے کہ میں اس علاقے میں بار بار آؤں۔، لیکن بدقسمتی سے گزشتہ نصف صدی میں مجھے صرف دو یا تین مرتبہ یہاں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے، میں جناب فاروق صاحب کا اور دیگر احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس محفل کا اہتمام کیا تاکہ میں اسلامک بینکنگ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں، درحقیقت آج جو موضوع مجھے دیا گیا ہے وہ بہت ہی وسیع ہے اور اس کی وضاحت ایک گھنٹے میں، بلکہ رات بھر میں بھی نہیں کی جاسکتی، لیکن میں اس موضوع سے متعلق چند بنیادی اہم مسائل کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔

اولاً ہم تجارت کے اسلامی احکام یا مالیات سے متعلق بات کریں گے۔ یہ احکامات دو قسم کے ہیں، ایک قسم کے احکامات وہ ہیں جو تجارت کے اخلاقی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ صرف اسلام ہی نے بیان نہیں کیے، بلکہ ان ساری باتوں کا وہ لوگ بھی اعتراف کرتے ہیں جو باہمی آزاد تجارت اور معاملات کے قائل ہیں، وہ اخلاقی اصول یہ ہیں کہ سچائی، براہ راست صاف اور شفاف معاملات کرنا اور دھوکے بازی یا غلط فہمی کا موقع نہ دینا۔ یہ وہ چند اخلاقی پہلو ہیں جو صرف اسلام سے ہی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ دیگر مذاہب میں بھی پائے جاتے ہیں۔

فرق یہ ہے کہ جب دوسرے غیر مذہب یا لامذہب لوگ اصول، سچائی اور باہمی صفائی کی بات کرتے ہیں تو وہ بنیادی طور پر اس دنیا کی بھلائی اور بہبودی کو ہی مقصود بناتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے معاملات میں سچ بولتا ہے یا وہ انصاف

کے ساتھ معاملہ کرتا ہے وہ ایک اچھا تاجر مانا جائے گا، یا ایک اچھا شخص سمجھا جائے گا، اس کو آخرت میں، کوئی اجر نہیں ملے گا، اگر لوگ اس کو کوئی بدلہ دینا چاہیں تو اس کو صرف اچھا نام دے سکتے ہیں، اسے ہمیشہ یاد کر سکتے ہیں، تعریف کر سکتے ہیں بس، لیکن جب اسلام سچائی اور معاملات میں اخلاقی پہلو کی بات کرتا ہے تو وہ صرف اس دنیا تک محدود نہیں رہتا، اسلام کہتا ہے سچائی، معاملات میں صاف صاف طریقے سے پیش آنا اور ہر قسم کی دھوکے بازی سے دور رہنا، ان ساری چیزوں کا اجر آخرت میں بھی دیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی جس کو ہم نے اپنی اس دنیوی زندگی سے نکلنے کے بعد اور مرنے کے بعد اختیار کرنا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ الشُّهَدَاءِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“[1]

مخلص اور سچا تاجر جو قابلِ اعتماد ہو، وہ آخرت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

لہٰذا اس کی سچائی صرف اس کو دنیا تک محدود زندگی عطا نہیں کرتی، بلکہ اس سے بھی آگے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آخرت میں بہترین زندگی عطا کرتی ہے، جس کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ نتیجہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اخلاقیات دیگر مذاہب میں بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی ۲/۴۹۸ (۱۲۰۹) وقال هذا حديث حسن۔ وسنن ابن ماجه ۳/۵۱۰ (۲۱۳۹)۔

بہر حال! ہم جب حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بعض اوقات غیر مسلم لوگ مسلمانوں سے زیادہ مخلص یا معاملات میں سچائی اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بدقسمتی کی بات ہے جو ہم دیکھتے ہیں، لیکن الحمد للہ ہمارے پاس کامل اصول ہیں۔ اخلاقی اصول ہیں جو ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی اصلاح خود کرلینی چاہیے۔ بدقسمتی سے غیر مسلم ممالک اور غیر مسلم سماج کے لوگ ان اصولوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان کی بدولت وہ لوگ نہ صرف اس دنیا کی بھلائیوں کا بڑا حصہ حاصل کیے ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے اس کی وجہ سے اپنی تجارت اور کاروبار میں بھی اضافہ کرلیا ہے۔ میرے والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سچائی اور حقیقت کبھی بھی مغلوب نہیں ہوسکتی، کیونکہ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْهِ کی بنیاد پر سچائی اور حقیقت ہمیشہ باطل پر غالب ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱)

باطل کو تو مٹنا ہی ہے۔

غیر مسلموں کی ترقی کا راز

مگر آپ محسوس کرتے ہیں یا دیکھتے ہیں کہ جو لوگ راہ راست پر نہیں ہیں، پھر بھی وہ ترقی کرتے جارہے ہیں، وہ اپنی تجارت اور کاروبار میں بڑھ رہے ہیں، وہ اپنی مالیات اور تجارت میں آگے چل رہے ہیں، تو غور کرنا چاہیے کہ کوئی نہ کوئی حق بات ہے جس کو انہوں نے اپنایا ہے اور وہی حق بات انہیں دنیا میں ترقی

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت (۸۱)۔

دے رہی ہے، لہٰذا برادران اسلام اور مسلم تاجر حضرات اس پر غور کریں اور اپنے طریقۂ کار اور اصولوں پر نظرثانی کریں اور ان اخلاقی اصولوں پر غور کریں۔

میں عرض کر رہا تھا کہ وہ اخلاقی اقدار اور اصول جو کہ سارے انصاف پسند سماجوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان کو اپنایا جائے، اس کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات جو میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی احکام اور اصول صرف اخلاقیات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کے بعض قانون کی فلسفیانہ بنیادیں ہیں جن کی بنیاد پر اسلام نے ہدایات فراہم کی ہیں۔ اسلامی تعلیمات یا اسلامی احکام صرف اخلاقی بنیاد پر ہی نہیں، بلکہ فلسفی اور قانونی اصول پر وضع کیے گئے ہیں جن پر اسلامی اقتصاد مبنی ہے۔ وہ اصول اور احکام اسلامی کاروبار، اسلامی مالیات اور اسلامی تجارت کے بھی بنیادی اصول ہیں۔ اس بارے میں پائی جانے والی چند غلط فہمیوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی غلط فہمی

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ مذہب کے معنی ہیں چند اعتقادات، دعوے اور بعض مذہبی رسومات وغیرہ۔ بس۔ اس کا سماجی واقتصادی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام ہرگز اس قسم کا ایک مذہب نہیں ہے۔ اسلام کے اپنے اصول ہیں اور احکامات ہیں جو نہ صرف عبادات، اعتقادات اور امور زندگی، بلکہ وہ ہمارے سماجی اور اقتصادی زندگی پر بھی اپنا رسوخ رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے تقریباً تین صدیوں سے یہ اصول اور احکامات ہماری روز مرہ کی زندگی سے علیحدہ

کر دیے گئے ہیں اور وہ صرف مساجد ومدارس اور بعض بزرگوں کے مزارات اور خانقاہوں میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا ہمارے کاروبار اور بازاروں سے، ہماری تجارت اور خرید اور فروخت سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لہٰذا لوگ اس طرح سوچنے لگے کہ اسلام صرف بعض عبادات تک محدود ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جسے دور کرنا ضروری ہے۔اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (۱)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف مسجد میں ہی مسلمان نہیں، بلکہ تم بازار میں بھی مسلمان ہو۔تم خرید وفروخت کے وقت بھی مسلمان ہو۔ ان اوقات میں بھی تم مسلمان ہو اور مسلمان وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سپرد کردے۔اس لیے یہ پہلی غلط فہمی ہے جسے دور کیا جانا چاہیے۔

دوسری غلط فہمی

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ جب ہم اسلامی تجارت کے احکامات کی بات کرتے ہیں، اسلام کے متعلق احکامات اور اسلامی مالیات کے اصول کی بات کرتے ہیں تو بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ اصول اور احکامات صرف مسلمانوں کے لیے محدود اور مخصوص ہیں اور غیر مسلموں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۰۸)۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم اسلامی احکام اور اصولوں کو اہمیت دیتے ہیں، ان پر اصرار کرتے ہیں تو یہ صرف اس لیے ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں ان اصول اور احکامات پر عمل کرنا ہے۔

یاد رکھیے! یہ بات صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت یہ احکامات اور اصول جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں ملے ہیں۔ یہ سب نہ صرف مسلمانوں کے لیے عطا ہوئے ہیں، بلکہ ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے عطا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ احکامات صرف مسلمانوں کی بھلائی کے لیے نہیں ہیں، بلکہ ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں۔ یہ ایسے اصول اور احکامات ہیں کہ اگر انہیں صحیح طریقے پر استعمال کریں تو دنیا کے تمام انسانوں کی بھلائی ہوگی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جس کی وضاحت میں تھوڑی دیر بعد کروں گا۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اسلامی اصول اور احکامات صرف مذہب اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک مخصوص مذہب کے لوگ ہی ان کی اتباع کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے کئی قسم کے اقتصادی نظاموں کا تجربہ کیا ہے۔ سرمایہ داری نظام، اشتراکی اقتصادیات، یہ دونوں آپس میں متضاد ہیں اور ان کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ سرمایہ داری کے اپنے اصول ہیں، اشتراکیت کے اپنے اصول ہیں، جن کی بنیاد پر وہ اپنی اپنی اقتصادیات کو تشکیل دیتے ہیں۔ اگرچہ سوشلزم جیسا کہ آپ جانتے ہیں ناکام ہو چکا ہے۔ خصوصاً گزشتہ چند سالوں سے سوشلزم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، پھر بھی اپنے نظریات کی بنا پر وہ آج بھی قائم ہے۔ جن ملکوں میں وہ پہلے رائج تھا ان میں آج بھی یہ رائے پائی جاتی ہے کہ اشتراکیت کی پھر سے تجدید ہونی چاہیے۔ جس طرح ان کے اپنے فلسفے ہیں، ان کے اپنے اصول ہیں، اسی طرح اسلام کے اپنے فلسفے ہیں، اس کے اپنے

اصول ہیں اور ان اصولوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسانوں کی بھلائی کے لیے ایک عادلانہ خوش گوار اقتصادی نظام قائم ہو۔

اسلامی اصولوں میں ہی ہر انسان کی کامیابی مضمر ہے

لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری کاروباری زندگی میں ان اسلامی اصولوں پر عمل ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، ہرگز نہیں، بلکہ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر ان اصولوں پر عمل ہوا تو لوگ اس سے بھی کہیں بہتر حالت میں ہوں گے کہ جس حالت میں وہ آج ہیں۔ مثلاً دولت کا انصاف کے ساتھ تقسیم ہونا، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ہر شخص اور انسان کو اس میں کوشاں رہنا چاہیے۔ انسانوں کی دولت انصاف کے ساتھ تقسیم ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ صرف مال دار اور غنی لوگ اس اقتصاد سے فائدہ اٹھائیں اور غریب لوگ اس کی وجہ سے دولت سے محروم رہ جائیں۔ اس کی آفتوں سے ہر وقت دوچار رہیں، لہٰذا ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلامی احکامات اور اسلامی اصولوں کو اپنانے کی وجہ سے سارا عالم مسلم بن جائے گا۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ بنیادی اصول ہیں، اگر ان پر عمل کرلیں گے تو آپ آج جس حالت میں ہیں اس سے بھی بہتر حالت میں ہوجاؤ گے۔ دولت کی تقسیم میں، کسی بھی مستقل اقتصادی نظام میں، ایک منصفانہ اقتصادی نظام میں، اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے کسی کو بھی کسی بھی مذہب کے اختیار کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ بہر حال! ہم آپ کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں، اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں، مگر ایک بحث اور ایک دلیل کی بنیاد پر۔ جہاں تک اسلامی

اقتصادی نظام کے لاگو کرنے کا تعلق ہے اور یہ اس کا ایک جز بھی ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لوگوں کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

انوکھے بحران کا سامنا

آج دنیا ایک ایسے انوکھے بحران سے گزر رہی ہے، جو اس بحران سے بھی خطرناک ہے جو ۱۹۲۹ء میں آیا تھا۔ لہٰذا یہ ایک بہت ہی خطرناک دور ہے جس کا آج کی دنیا کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ لوگ جو اس بحران کے اسباب کو جاننا چاہتے ہیں، اس کے حل کے متلاشی ہیں، انہوں نے مسلمانوں سے مشورے طلب کیے ہیں۔ اس پس منظر میں ورلڈ اکنامک فورم نے مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ دنیا آج ایک مالیاتی بحران، ایک کٹھن دور سے گزر رہی ہے اور ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اسلامی اصول ہمیں ان حالات میں کس قسم کی ہدایات فراہم کرتے ہیں۔ آپ ہمارے سامنے ان اسلامی اصولوں کی وضاحت فرمائیں جن سے اس مشکل کے حل کرنے میں مدد مل سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ہمیں یہ دعوت اس لیے دی ہے کہ مسلمانوں کی مدد ہوسکے، نہیں۔ انہوں نے ہم سے یہ وضاحت اس لیے چاہی ہے تا کہ ساری انسانیت کا فائدہ ہو۔ یہ بات اسی خط میں موجود ہے، لیکن ہم میں تبدیلی کس طرح آئے گی۔ کیا ہم بھی اس گمراہی میں ملوث ہوجائیں جس کی کوئی انتہاء نہ ہو، لہٰذا آپ ہمیں بھی وہ چند اصول بتایئے جو ہمارے لیے اس مشکل، مالیاتی بحران سے نکلنے میں مددگار بن سکیں۔

اس موضوع پر میرا تفصیلی مقالہ

اس کے جواب میں میں نے ایک تفصیلی مقالہ اس موضوع پر لکھا تھا جو کہ ورلڈ اکنامک فورم کے سالانہ اجلاس میں متعارف کیا گیا اور میں نے بھی فورم کی نشست میں شرکت کی۔ اگرچہ میں اس قسم کی محفلوں میں شرکت کی خواہش نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس موضوع کی اہمیت کی وجہ سے میں وہاں گیا تھا اور یہ مقالہ وہاں پڑھا گیا۔ اس کو طبع کر کے اس کا اجرا بھی کیا گیا۔ پریس کانفرس کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مقامی میڈیا کے سارے لوگ موجود تھے، انہوں نے اس مقالے کو اپنی ویب سائٹ پر بھی جاری کیا۔ بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ سمجھیں کہ ہمیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ اس کو اسلامی اصول کہیے یا کوئی دوسرا نام دیجیے۔ یہ وہ اصول ہیں اگر ہماری اقتصادی کاروائیوں میں ان پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ ضرور ہمیں ان کا پھل ملے گا۔

وہ احکام و اصول کیا ہیں؟

اب سمجھیے یہ کیا احکام اور اصول ہیں؟ میں آپ کو مختصراً وہ احکام اور اصول بتانا چاہتا ہوں جو قرآنِ کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ سے ہمیں ملے ہیں۔ ان میں سے بنیادی اصول جو قرآنِ کریم میں موجود ہے وہ یہ ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ (۱)

لوگوں کی دولت صرف مال دار لوگوں کے درمیان گھومتی نہ رہ جائے، بلکہ

---

(۱) سورۃ الحشر آیت (۷)۔

وہ ان لوگوں تک بھی پہنچنی چاہیے جو مال و دولت کے اعتبار سے نچلے طبقہ میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک بنیادی اصول ہے جو خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔

اس اصول کی تعمیل کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بعض اوامر ونواہی عطا فرمائے ہیں کہ اگر ان کی پورے طور پر پیروی کریں گے تو غریب طبقے کے لوگوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اگر آپ سرمایہ داری نظام کا مطالعہ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ اس نظام میں ہر اقتصادی کاروائی نفع کمانے کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور ہر آدمی کو اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے نفع کمائے اسے اس کا حق ہے اور اس نظام میں یہ بھی ہے کہ اگر دو آدمی کسی معاملے میں اتفاق کرلیں تو وہ معاملہ جائز ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو بھی معاملہ ہو اگر فریقین کے اتفاق کی بنیاد پر کیا جائے تو وہ جائز ہے، اسی بنیاد پر انہوں نے سود کو جائز قرار دیا، جوے کو جائز کہا، انہوں نے قیاسی معاملات کو بھی جائز کہا۔ ان تمام معاملات کی انہوں نے فریقین کے اتفاق کی بنیاد پر اجازت دی ہے، جب دو آدمی کسی کام پر متفق ہوں تو کوئی بھی طاقت ان کے درمیان مداخلت نہیں کرسکتی۔

اردو میں ایک مقولہ ہے ''میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی'' اگر لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کسی بھی معاملے میں اتفاق کرلیں تو کسی کو ان کی اس آزادی میں مداخلت کرنے کا حق یا اس کی طاقت نہیں ہے، لیکن اسلام کہتا ہے کہ اگر دو شخص کسی ایسے معاملے میں ایک دوسرے سے اتفاق کر بھی لیں جو سماج کے لیے مضر ہو تو آپس کے اتفاق کے باوجود پھر وہ معاملہ جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اسی لیے سود کو آپس کے اتفاق کے باوجود حرام قرار دیا گیا۔ اسی لیے جوا حرام قرار دیا گیا۔ اسی لیے قیاسی معاملات حرام کیے گئے۔

حرمتِ سود کی وضاحت

میں آپ لوگوں کے سامنے سود حرام کیے جانے کے اسباب کی مختصر وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بعض اوقات بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غریب طبقے کے لوگ مال دار لوگوں سے قرض لیا کرتے تھے۔ ان لوگوں پر اس طرح ظلم کیا جاتا تھا کہ ان سے اصل قرض سے کئی گنا سود لیا جاتا تھا، اس لیے اس کو حرام قرار دیا گیا، لیکن آج کل ہمارے بینکوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مالدار لوگ ہی بینکوں سے قرض لیتے ہیں اور وہ اس کے ذریعے بہت کچھ نفع کماتے ہیں، جب بینک ان سے سود لیتا ہے تو اسے کیوں حرام قرار دیا جاتا ہے یا غیر قانونی کہا جاتا ہے؟ یہی سوال ہے جو اکثر بہت سارے مواقع پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل کہ میں اس کا صحیح جواب دے سکوں، میں ایک لطیفہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک ہندوستانی مغنی (گانا گانے والا) حج کے لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ گیا۔ حج کے ارکان ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ کا سفر اس نے ایک قافلے کے ساتھ کیا۔ مدینہ جانے کے راستے میں انہیں کسی قریے میں رکنا پڑا۔ کھانے کے بعد وہاں ایک عرب گانے والے نے موسیقی کے ساتھ گانا شروع کیا، لیکن اس کی موسیقی اور گانا اس قدر خراب تھا کہ ہندوستانی موسیقی اور گانے والے نے کہا، ''قربان جائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر بہت ہی مہربان ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان عرب گانے والوں میں مبعوث کیا گیا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر موسیقی کو حرام کیا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری

موسیقی اور میرے گانے کو سن لیتے تو ہرگز موسیقی کو حرام نہ فرماتے۔"

بہرحال اس قسم کا سوال سود اور جوے کی تائید میں بھی کھڑا کیا جاتا ہے۔ درحقیقت انفرادی قرض پر جو سود لیا جاتا ہے وہ اس قدر مہلک اور خطرناک نہیں ہوتا جتنا کہ بینک کا سود انسانیت پر آفتوں کا سبب بنا ہوا ہے۔ بہت ہی کم لوگ بینکوں سے قرض لیتے ہیں۔

آج کے بینکوں کا غلط طریقۂ کار

میں نے ایک مرتبہ اعداد کا جائزہ لیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے ملک پاکستان میں 0.0001% لوگ ہی بینکوں سے قرض لیتے ہیں۔ عام لوگ بینکوں میں پیسے جمع کراتے ہیں اور پھر ان میں 0.0001% لوگ ہی اپنے خاص کام و کاروبار کے لیے اور اپنے فائدے کے لیے قرض لیتے ہیں اور بے حد نفع ان پیسوں سے کما لیتے ہیں اور یہ لوگ بہت ہی کم رقم بینکوں کو سود کی شکل میں ادا کرتے ہیں، بینکوں میں پیسے رکھنے والوں کو بہت ہی کم حصہ سود کی شکل میں بینکوں کے ذریعے دیا جاتا ہے اور یہ جو بہت کم مقدار بینکوں کو سود کی شکل میں دی جاتی ہے اس کی وجہ سے ملک کے زر کی مقدار کے پھیلنے inflation میں کوئی مدد نہیں ملتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ درحقیقت بینکوں میں پیسہ جمع کرنے والوں کو کچھ بھی نہیں دیتے، سارا نفع ان کو ہی پہنچتا ہے۔ عام لوگوں کو فائدے میں سے کچھ بھی نہیں دیتے۔ جو کچھ ان کو بینک کے سود کی شکل میں دیتے ہیں وہ سود مصنوعات کی قیمتوں کا جزء بن جاتا ہے۔ جب کبھی اشیاء کی قیمتیں متعین ہوتی ہیں اس سود کو بھی اس میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ ایک عام آدمی کو جب -/100 روپیہ کا نفع 7 روپیہ ملا ہے۔ تو جب وہ بازار جاتا ہے، روٹی

اور مکھن خریدتا ہے تو اس نے جو کچھ نفع کی شکل میں بینک سے حاصل کیا تھا اس کو واپس ادا کر دیتا ہے، کیونکہ روٹی مکھن اور ہر چیز کی قیمت میں بینک کا سود بھی شامل ہوتا ہے جس کو یہ صنعتیں عام آدمی سے وصول کرلیا کرتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی نفع ہوتا ہے تو یہ سارا نفع انہی کو مل جاتا ہے جو صرف %0.0001 ہیں۔ اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو پھر بھی سارا نقصان عام آدمیوں پر ہی پڑتا ہے۔ یہی آج کے بینکوں کے سود کا طریقہ ہوتا ہے۔

دوسرا معاملہ

دوسرا معاملہ یہ ہے کہ سود کا مطلب یہ ہے کہ آپ زر یعنی پیسوں کا ہی کاروبار کررہے ہیں جب کہ اسلامی اصول کے تحت پیسہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی تجارتی مال نہیں ہے جس کی خرید وفروخت ہوسکے۔ زر یعنی پیسہ اللہ نے صرف اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ وہ زر مبادلہ کے طور پر استعمال ہو۔ لہٰذا زر کوئی تجارتی مال نہیں ہے جس میں خرید وفروخت ہو سکے۔ اب سودی نظام نے زر کو ایک تجارتی مال بنالیا ہے۔ جس میں روزانہ کاروبار کیا جاتا ہے اور اس تجارت کی وجہ سے جس زر میں کاروبار ہوتا ہے اس کی وجہ سے ایک نئی مخلوق وجود میں آگئی ہے اور وہ ہے بینکوں کا پیدا کیا گیا زر۔ وہ حضرات جنہوں نے اقتصادیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ بینک ایک مصنوعی زر پیدا کرتا ہے جو صرف کمپیوٹر کے ارقام (digit) کی شکل میں موجود ہوتا ہے، حقیقت میں کوئی پیسہ نہیں ہوتا۔ ایک سو روپیہ ضرب ہو کر ایک ہزار روپیہ بن جاتے ہیں، اس کے علاوہ اس زر کی اور کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو fractional rescue system نے ایجاد کیا ہے کچھ زر بینک نے مصنوعی طور پر وجود میں

لائے ہیں، صرف فرضی طور پر اور قیاس اور گمان کی بنیاد پر، حقیقت میں نہیں۔ اس نئی ایجاد کے بعد آپ جانتے ہیں کہ ایک بہت بڑی مارکیٹ ہے، فرضی مشتقات کی ایک بہت بڑی مارکیٹ جس میں آئندہ بیچنے کے وعدہ پر اختیارات فروخت ہو رہے ہیں، اور ان کا باہمی تبادلہ ہو رہا ہے، یہ سارے معاملات آج ہمارے مالیاتی نظام میں پائے جاتے ہیں، اور اپنی اصلیت کو پہنچ چکے ہیں۔

یہ وہ اقسام ہیں جن کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ کوئی تجارتی مال، نہ کوئی حقیقت، کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب صرف اندازے اور قیاسات ہیں اور یہ اندازے اور قیاسات ضرب ہوتے چلے جاتے ہیں اس قدر کہ ان فرضی مشتقات کی قیمت آج کی دنیا کی کامل جی۔ ڈی۔ پی۔ سے آٹھ گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ ساری دنیا کی GDP، صرف ایک ملک کی نہیں۔ ایک ماہر اقتصاد نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ فرضی مشتقات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر انہیں ڈالر میں بدل دیا جائے تو وہ سو گنا ہو جائیں گے۔ سو گنا!!! یہ ہے ان فرضی مشتقات کی قیمت جن میں کوئی زر نہیں ہوتا۔ یہ سبب ہے اس مالیاتی بحران کا۔

مالیاتی بحران کیسے شروع ہوا

میں آپ لوگوں کو اس بحران کے متعلق بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کیسے شروع ہوا۔ یہ بحران اس طرح شروع ہوا کہ امریکہ میں گھروں کے خریدنے کے لیے قرض دینے کی گرم بازاری کا دور چلا۔ لوگوں نے قرض لینا اور گھر خریدنا شروع کیا اور پھر اسے مارکیٹ میں فروخت کر کے پھر سے قرض لینے لگے اور یہ سلسلہ قرض کا چلنے لگا۔ جب بینکوں نے یہ دیکھا کہ یہ بہت فائدے کا کاروبار ہے تو وہ

آپس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگے جس کی وجہ سے قرض لینے کے سلسلے کو ہی کچل دیا اور یہ حالت ہونے لگی کہ مزید قرض کا سلسلہ جاری رکھا گیا اور بعض کمپنیوں کو فروخت کردیا گیا۔ قانونی کاروباری کمپنیوں کو صرف یہ پیکج (package) حاصل کرنے کے بعد جو کہ صرف ایک دستاویز ہے، کو فروخت کیا گیا، پھر ان دستاویزات کو بار بار فروخت کیا جارہا تھا، لیکن جب اصلی قیمتوں میں گراوٹ آئی یہ سارا ڈھانچہ (structure) جو کہ ان قرضوں کی بنیاد پر بنایا گیا تھا گرگیا اور بینکوں نے اپنے مالیاتی تعاون کو روک لیا اور ان کمپنیوں کو قرض دینا بند کردیا جو ان قرضوں پر اعتماد کیے ہوئے تھے۔ لہٰذا قیمتوں میں بھاری گراوٹ آئی اور اتنی شدید گراوٹ کہ سو سے صفر (100 to 0) تک پہنچ گئی اور کئی بینک اور کمپنیاں دیوالیہ ہوگئیں۔ لہٰذا اگر آپ ان حالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بنیادی سبب اس مالیاتی بحران کا صرف سود ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرضوں کا فروخت کرنا خود قرآنِ کریم اور سنتِ رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔[1] تیسری بات یہ کہ بغیر قبضے کے ان کو فروخت کرنے کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہوگئی۔ اسٹاک مارکیٹ میں آپ حصوں کو فروخت کرتے ہیں، مگر وہ آپ کی ملکیت میں نہیں ہوتے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ مالیاتی بحران کا بنیادی سبب فرضی مشتقات ہی قرار پایا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اور

---

(۱) مصنف عبد الرزاق ۹۰/۸ (۱٤٤٤۰) وشرح معانی الآثار للطحاوی ۲۱/٤ (۵۵۵٤) طبع عالم الکتب۔ وسنن الدارقطنی ٤۰/٤ (۳۰٦۰)۔ والمستدرک للحاکم ٦۵/۲ (۲۳٤۲) وقال: هذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاه وقیل عن موسی بن عقبة عن عبداللہ بن دینار. وقال الذهبي في "التلخیص": علی شرط مسلم.

رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے سود کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح خالی فروخت اور اصلی / ناقص کے فرضی مشتقات کو ہمارے لیے منع فرمایا ہے۔ اگر ہمارا اقتصادی نظام ان اصولوں کی پیروی کرتا تو اس قسم کا بحران پیدا نہ ہوتا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

اسلامی اصول ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں

اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ اصول ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے ہیں۔ صرف ایک سماج یا امت کے لیے نہیں۔ الحمد للہ ہمارے پاس یہ اصول موجود ہیں کہ ہر مالیاتی اقدام اسلامی شریعت کی رو سے اسباب/ملکیت پر مبنی ہو، حقیقی ملکیت ہونی چاہیے۔ حقیقی اقتصاد وہ ہے جو حقیقی ملکیت کو قائم کرے۔ اگر ان اصولوں کی اتباع کی جائے تو ان شاء اللہ یہ ضرور انسانی بہبودی اور بھلائی کے لیے کارآمد ہوگا اور یہی ان اصولوں کا مختصر تعارف ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہم ایک سماج کا جز ہیں اور ہم رواجی اقتصادی اصولوں کے سایے میں ہیں۔ جیسے اشتراکی اقتصادیات، ہم کس طرح اس سے نکل سکتے ہیں۔ حرام کاروائیوں کو کیسے ترک کر سکتے ہیں۔ مثلاً سود، جوا اور دیگر غیر اخلاقی چیزوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں، تو میں گزارش کروں گا کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ قرآنِ کریم اور سنت رسول ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں کا علم حاصل کرے۔ آپ نے اس مشہور حدیث شریف کو سنا ہوگا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [1]

کہ علم کا حاصل کرنا ایک شرعی حکم ہے، کیا سارے علوم کا علم رکھے؟ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے اپنے امورِ زندگی کی بنیاد پر ان کے احکام کا جاننا ضروری ہے۔ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اگر آپ ایک تاجر ہیں تو یہ جانیں کہ حلال چیزیں کیا ہیں؟ حرام چیزیں کیا ہیں؟ آپ اگر ملازم ہیں تو یہ کہ نوکر کے لیے حلال چیزیں کیا ہیں؟ حرام چیزیں کیا ہیں؟ اگر آپ ایک کاشت کار ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کن چیزوں کی زراعت کی اسلام میں اجازت ہے، کن چیزوں کی نہیں؟ ہر تاجر کے لیے لازمی ہے اور یہ اس کی مذہبی ذمہ داری ہے کہ اسے جائز اور ناجائز کا علم ہو۔ لہٰذا آپ کو پتہ ہو کہ آپ کے کاروبار میں حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ پھر اس کے مطابق عمل کریں۔ میں گزارش کروں گا کہ ہر مسلمان کو ان احکامات، مذہبی ذمہ داریوں اور اصولوں کو جاننا چاہیے اور ہر زبان میں کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ چند کتابوں کے نام ہمارے بھائی نے ذکر کیے اور یہ کتابیں عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں ملتی ہیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجه ۲۱٤/۱ (۲۲٤) ومسند ابی یعلی ۲۲۳/۵ (۲۸۳۷) والمعجم الا وسط للطبرانی ۲۸۹/۲ (۲۰۰۸)۔وقال السيوطي في "الدرر المنتثرة" ص۱٤۱ (۲۸۳): "رُوِيَ من حديث أنس، وجابر، وابن عمر، وابن عباس، وعلي، وأبي سعيد، وفي كل طرقه مقال، وأجودها طريق قتادة وثابت عن أنس، وطريق مجاهد عن ابن عمر. وأخرجه ابنُ ماجه عن كثير بن شنظير، عن محمد بن سيرين، عن أنس، وكثير مختلَف فيه، فالحديث حسنٌ. وقال ابن عبد البر: رُوِيَ من وجوه كلُّها معلولة، ثم روى عن إسحاق بن راهويه أنَّ في إسناده مقالاً، ولكن معناه صحيح. وقال البزار في "مسنده": رُوِيَ عن أنس بأسانيد واهية، وأحسنها ما رواه إبراهيم بن سلام، عن حماد بن أبي سليمان... وقال المزي: هذا الحديث رُوِيَ من طرق تبلغ رتبة الحسن".

تجارت آخرت کے استحضار کے ساتھ کریں

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس سے بہر حال ہمیں جانا ہے اور نہیں معلوم کہ کب موت آجائے۔ لہٰذا کاروبار کو آخرت کی بھلائی کا احساس رکھتے ہوئے کرنا چاہیے۔ ارشاد ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ (۱)

قرآنِ کریم میں یہ بھی ارشاد ہے:

وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۲)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے آخرت کو طلب کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہی مال آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اگر آپ اس مال کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے تحت استعمال کریں گے تو وہی مال تمہاری آخرت کی بھلائی کا سبب بنے گا۔ میں کہا کرتا ہوں جیسا کہ میں نے سوئٹزرلینڈ میں ورلڈ اکنامک فورم میں بھی کہا جو In God we trust بینک آف امریکہ سے جاری ہونے والے ہر ڈالر پر یہ جملہ

---

(۱) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔
(۲) سورۃ القصص آیت (۷۷)۔

لکھا ہوتا ہے In God we trust ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہر ڈالر پر یہ موجود ہے۔ میں نے دیکھا کہ سویزرلینڈ میں بھی ہر ڈالر پر یہ جملہ لکھا ہوا ہے In God we trust اور جب ڈالر کمانے کا وقت آتا ہے، جب ڈالروں کو

صرف کرنے کا وقت آتا ہے، اس وقت خدا سے پوچھا نہیں جاتا، بلکہ خدا کو منظر سے ہی ہٹا دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ صرف ایک اقرار ہے جو اس نوٹ پر ہوتا

ہے اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، تو پھر خدا کی طرف متوجہ بھی ہو جاؤ، وہ ان ڈالروں کو کس طرح خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے؟ یہاں خدا پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا انہوں نے جب میرے مقالے کی تعریف کی اور اس کا مختصر بیان کیا تو ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور اس پر موجود جملے We Trust In God پر نشان لگایا۔

بہرحال! اسلامی تعلیمات صرف اس دنیائے فانی کے لیے نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمارے مرنے کے بعد والی زندگی کی بھلائی کے لیے بھی ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم کب مرنے والے ہیں، ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس کو مرنا

ہے۔ دنیا میں بہت سارے مسائل ہیں جن میں اختلاف ہے اور اس حقیقت کا خدا پر ایمان نہ رکھنے والے ملحد بھی انکار نہیں کرتے۔ ہر انسان اس پر متفق ہے اور وہ اس پر بھی اتفاق کرتے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب مرے گا؟ لہٰذا موت کے بعد کیا ہونا ہے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رسول اور انبیاء علیہم السلام انسانوں کے درمیان آئے اور خبر دی کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اور یہ حقیقت بہت سارے الفاظ میں قرآنِ کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مذکور ہے۔ لہٰذا ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جو کماتے ہیں اور ہم خرچ کرتے ہیں یہ سب چیزیں ہمیں یا تو جنت دلائیں گی یا دوزخ میں لے جائیں گی۔ لہٰذا ہر انسان کو اس حقیقت

کا خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان الفاظ میں ہمیں کیا حکم فرماتا ہے۔
اب میں اجازت چاہتا ہوں، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ہدایت سے نوازے۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
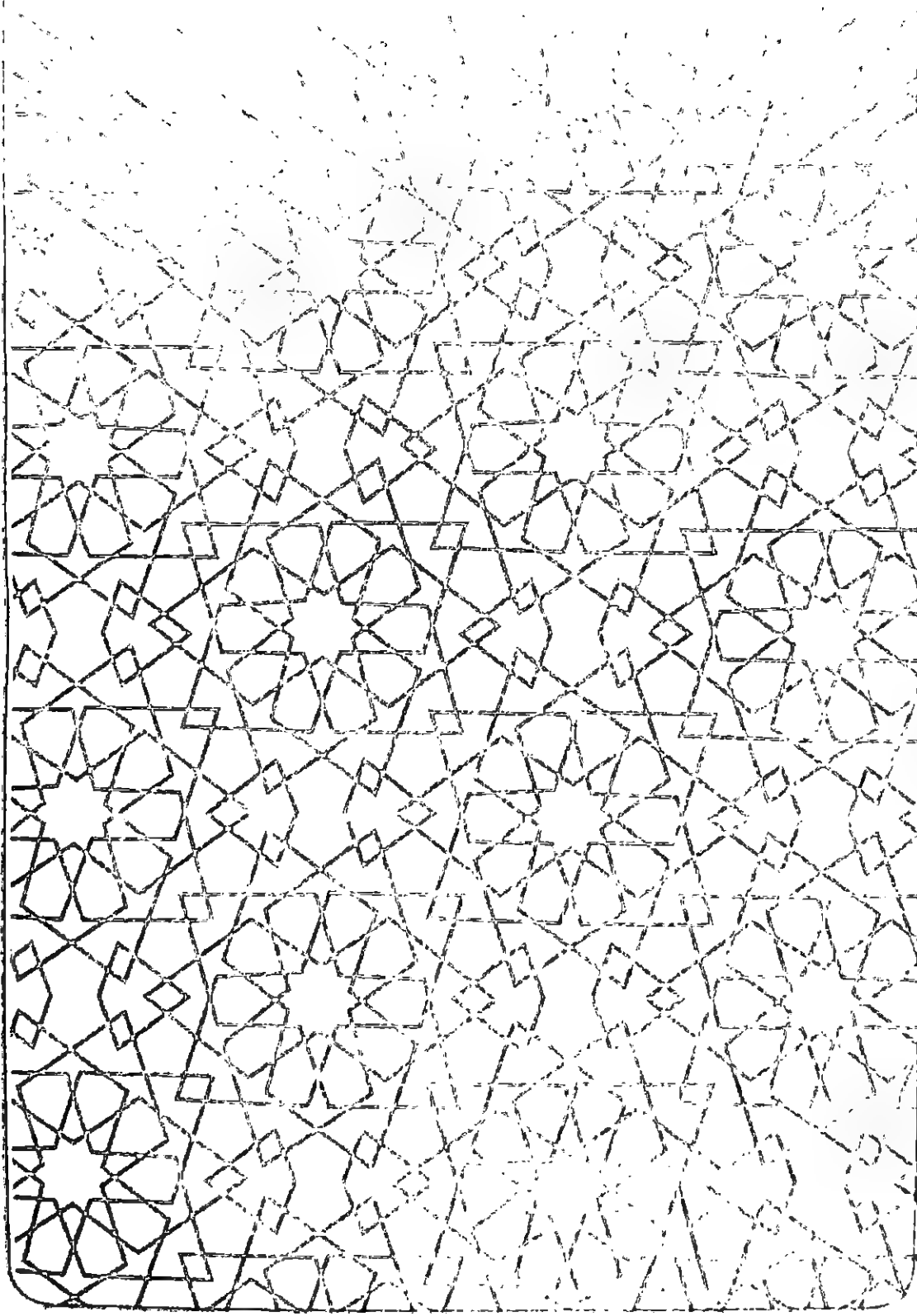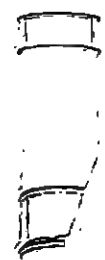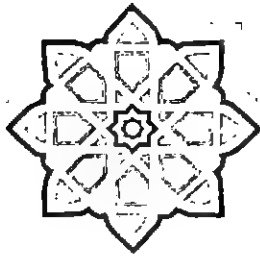
تجارت بذات خود ایک عبادت

(خطبات دورۂ ہند ص۱۴۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجارت

بذاتِ خود ایک عبادت ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ

عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۱)

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاہدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین۔

جناب صدرِ محترم اور معزز حاضرین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ میرے لیے بڑی مسرت کا موقع ہے کہ آپ حضرات سے خطاب کرنے کا موقع مل رہا ہے اور یہ مسرت اس بنا پر کئی گنا بڑھ گئی ہے کہ جو حضرات یہاں جمع ہیں وہ اپنی تجارت کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر اور عزم لے کر جمع ہوئے ہیں، اجتماعات اور جلسے بہت ہوتے رہتے ہیں اور تقریریں بھی ہوتی رہتی ہیں، لیکن وہ اجتماع یا جلسہ یا تقریر عملی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی، اس لیے کہ وہ نشستن وگفتن وبرخاستن کی حد تک محدود ہوکر رہ جاتی ہیں، لیکن جناب مکرم رفیق احمد صاحب نے ابھی جو جملہ کہا اس سے میری ہمت میں بہت اضافہ ہوا، انہوں نے فرمایا کہ آج ہم اس عزم کے ساتھ یہاں جمع ہوئے، کہ ہم اپنی تجارت، معیشت اور اپنی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کریں گے اور جو باتیں آج ہمارے سامنے آئیں گی ان کو سن کر یہاں سے یہ عزم لے کر اٹھیں گے کہ آج کے بعد ہم دوسرے انسان ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے جو انہوں نے کہہ دی، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) سورۃ المنافقون آیت (۹)۔

مسلمان کی ساری زندگی عبادت بن سکتی ہے

اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا جس میں انسانی ضروریات کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا، آپ شاید یہ جانتے ہوں گے کہ قرآنِ کریم نے دنیا میں انسان کی پیدائش کا جو مقصد بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۱)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے انسان اور جنات کو کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا، بلکہ صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں تو جب انسان کے پیدا کرنے کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ صبح سے لے کر شام تک، شام سے لے کر صبح تک اس کا کوئی اور کام نہ ہو سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو باوجود مقصدِ تخلیق ''عبادت'' ہونے کے اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ اپنے بشری تقاضے پورے کرے یعنی اپنے اور اہل وعیال کے معاشی و رہائشی تقاضے پورے کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا طریقہ ہمیں عطا فرمادیا جس کے ذریعے ہم اپنی ساری ضروریاتِ زندگی پوری کر سکتے ہیں اور صرف ضروریات کی حد تک نہیں، بلکہ ان ضروریات کو عبادت بھی بنا سکتے ہیں۔

خدا کا قرب

دنیا کے بہت سے مذاہب ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو

---

(۱) سورۃ النازعات آیت (۵٦)۔

اس وقت تک آپ حاصل نہیں کر سکتے یعنی خدا کا قرب نہیں پا سکتے جب تک کہ دنیا کے سارے جھمیلوں کو خیر باد نہ کہہ دیں، خانقاہ میں جا کر بیٹھ جائیں اور پھر ذکر و تسبیح پر اپنا گزارہ کرلیں، بہت سے مذاہب وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دنیا اور دین ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ تو ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں آپ نے یقینا دیکھا اور سنا ہوگا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے کے بے شمار طریقے اختیار کر کے یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے خدا کا قرب حاصل کرلیا، آپ دیکھیں کہ وہ کس قسم کے مجاہدات کرتے ہیں، بھوکے رہ کر وقت گذارتے ہیں، ننگے رہ کر وقت گزارتے ہیں، سانس روک روک کر اپنے نفس کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ جس میں اگرچہ زندگی کا بنیادی مقصد عبادت بتایا گیا ہے، مگر عبادت کا مطلب یہ نہیں کہ سارے کاروبار چھوڑ کر بیٹھ جاؤ، بلکہ ایک ایسا طریقہ بتادیا کہ جس سے ضروریات زندگی بھی پوری ہو جائیں اور کاروبار بھی چلتا رہے نہ صرف کاروبار چلتا رہے، بلکہ کاروبار بذات خود ایک عبادت بن جائے۔

سچے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السلام وصدیقین کے ساتھ ہوگا

ایک مختصر سی بات ہے جس کی رعایت کرلی جائے تو وہ سارا کاروبار عبادت میں تبدیل ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ طریقے حلال پیدا کیے ہیں اور کچھ حرام، ان میں حرام طریقے کو چھوڑ کر حلال طریقے کو اختیار کرنا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ

لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۱)

(۱) سورة المنافقون آیت (۹)۔

کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم اپنی تجارت میں منہمک ہوکر اپنے دینی فرائض کو بھول جاؤ، اللہ تعالیٰ کی یاد کو فراموش کردو، بلکہ حلال طریقے سے اپنی روزی کمانے کی کوشش کرو، حدیث میں آتا ہے:

''اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِینُ مَعَ النَّبِیِّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ''(۱)

تاجر سچا ہو، امانت دار ہو وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تجارت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جن کی کتاب بخاری شریف بہت مشہور ہے اور اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہ کہلاتی ہے، وہ خود تاجر تھے۔ اللہ نے ان کو تجارت میں اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِینُ کا ایک نمونہ بنایا تھا، ان سے متعلق روایات میں آتا ہے کہ کچھ لوگ آئے اور ان سے کسی چیز کا سودا کیا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دل میں ارادہ کیا کہ اس چیز کی قیمت پانچ ہزار درہم لگاؤں گا، ابھی تک نہ وعدہ کیا تھا اور نہ سودا کیا تھا، بلکہ دل ہی دل میں نیت کرلی۔ اب ان لوگوں کے آنے میں دیر ہوگئی، شاید ایک دو دن گزرے ہوں گے اور وہ نہیں آئے اس دوران دوسری پارٹی آئی اور اس نے یہ چیز دس ہزار درہم میں مانگی۔ امام

(۱) سنن الترمذی ۴۹۸/۲ (۱۲۰۹) وقال ھذا حدیث حسن. وسنن ابن ماجه ۵۱۰/۳ (۲۱۳۹)۔

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک پارٹی آئی تھی میرا ارادہ اس کو پانچ ہزار درہم میں دینے کا ہوگیا تھا، لہٰذا اب میں آپ کو یہ چیز فروخت نہیں کرسکتا دوسری پارٹی نے کہا ابھی آپ کا سودا مکمل نہیں ہوا ہے۔ تو امام بخاریؒ نے فرمایا کہ سودا اور وعدہ تو نہیں ہوا، مگر میرے دل میں یہ ارادہ ہوگیا تھا کہ پانچ ہزار درہم میں اس کو دوں گا، لہٰذا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ دس ہزار درہم میں تمہیں فروخت کروں چنانچہ اس دس ہزار درہم کی آفر offer کو انہوں نے reject کردیا اور پھر جب وہ پہلی پارٹی آئی تو پانچ ہزار درہم میں وہ چیز اسے فروخت کی۔

صحیح بخاری کا ایک اور واقعہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہی اپنی کتاب بخاری شریف میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو زمین بیچی اور خریدار جب اس میں کھدائی کر رہا تھا تو سونے کے سکوں سے بھرا ہوا ایک مٹکا ملا۔ وہ اس مٹکے کو لے کر بیچنے والے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ بھائی تمہاری زمین میں یہ سونے کے سکے ملے ہیں، لہٰذا یہ تمہارے ہیں، اس لیے کہ میں نے صرف آپ سے زمین خریدی تھی، سونا نہیں خریدا تھا، تو اس نے کہا کہ میں نہیں لوں گا، کیونکہ میں نے جب زمین بیچی تو جو کچھ اس میں تھا وہ بھی تمہیں بیچ دیا، اب دونوں میں الٹا جھگڑا شروع ہوگیا ایک کہتا ہے لے لو اور دوسرا کہتا ہے نہیں لوں گا۔ یہاں تک کہ معاملہ قاضی کے پاس چلا گیا اور وہاں سارا واقعہ بیان کیا تو قاضی صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ تمہارے گھر کوئی لڑکا لڑکی ہے۔ تو اتفاق سے ایک کا لڑکا تھا اور دوسرے کی لڑکی تھی تو قاضی صاحب نے کہا کہ تم آپس میں لڑکا لڑکی کا نکاح کرادو اور یہ جو سونا ملا ہے یہ ان دونوں کے درمیان تقسیم کردو، اس طرح یہ تنازعہ

رفع ہوا یہ واقعہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ (۱)

تجارت بذات خود ایک عبادت ہے

غرض تجارت جب امانت و دیانت اور سچائی کے ساتھ کی جائے تو یہ بذات خود ایک عبادت بن جاتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجارت فرمائی اور بڑے پیمانے پر فرمائی، جس کو آج کل International Trade کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالیں چھوڑی ہیں، اگر یہ امانت و دیانت ہمارے اندر پیدا ہو جائے تو جتنی تجارتی سرگرمیاں ہیں یہ سب عبادت بن جائیں گی۔

ہندوستان میں اسلام

آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ہندوستان کی سرزمین جس میں الحمد للہ آج ہم سب مسلمان ہیں، اس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے کوئی جہاد کرنے والے لوگ نہیں تھے، جنہوں نے جہاد کر کے اسلام پھیلایا ہو، کوئی تبلیغی جماعت نہیں آئی تھی جس نے آکر اسلام پھیلایا ہو، یہاں سب سے پہلے اسلام پھیلانے والے کچھ صحابہ کرام رحمۃ اللہ علیہ اور تابعین رحمۃ اللہ علیہ تھے جو تاجر بن کر ملبار کے علاقے میں آئے تھے، انہوں نے اپنی تجارت کے ذریعے ایسے عظیم نمونے پیش کیے کہ لوگوں میں ان کی طرف کشش پیدا ہو گئی اور اس کے نتیجے میں وہ اسلام سے روشناس ہوئے اور اسلام کو ایک بہترین دین سمجھ کر قبول کر لیا۔ انہوں نے اپنے کردار سے، اپنے عمل، اپنی سچائی، اپنی امانت اور

---

(۱) صحیح البخاری ۱۷٤/٤ (۳٤۷۲)۔

دیانت داری سے اسلام کو پھیلایا۔ (۱)

ہمارے لیے ایک موقعہ

آج اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ حضرات کو یہ موقع عطا فرمایا کہ آپ حضرات ایک ایسے معاشرے میں تجارت کررہے ہیں جہاں ہر وقت آپ کو غیر مسلموں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور وہ آپ کی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں، آپ کی دکانوں پر ملازمت کرتے ہیں، اگر آپ ان کے سامنے اپنے عمل کا بہترین نمونہ پیش کریں گے، یعنی ان کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کریں گے، ان کے ساتھ سچائی کا معاملہ کریں گے اور ان کو دین برحق کی طرف دعوت دیں گے، تو آپ کی تجارت نہ صرف تجارت رہے گی، بلکہ ایک مجسم دعوت اور تبلیغ بن جائے گی اور اس کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب کا سبب بنے گا۔ روزانہ ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے، لیکن ہمیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمیں ایک داعی بھی بنایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۲)

مسلمانو! تم ایک ایسی امت ہو جو ساری انسانیت کے لیے نفع پہنچانے والی، بلکہ ساری انسانیت کو فلاح وبہبود اور راہ راست پر لانے کی کوشش تمہارے فرائض میں داخل ہے، جو لوگ غیر مسلموں میں دعوت کی محنت کرتے ہیں ان کو

(۱) ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام فی الهند ص ۸۸ تا ص ۹۰ للدکتور عبد المنعم النمر۔
(۲) سورۃ آل عمران آیت (۱۱۰)۔

چاہیے کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے ان کو قریب کریں، ان سے شفقت ومحبت کا معاملہ کریں اور ان کے دکھ درد میں شریک رہ کر ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ اس طرزِ عمل سے آپ دیکھیں گے کہ وہی نقشہ جو ملبار میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیش کیا تھا وہ ان شاء اللہ آج بھی پیدا ہوجائے گا اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

حلال کمائی میں برکت

اصل باتیں تو دو ہی ہیں، ایک یہ کہ تجارت کا جو کام بھی کیا جائے وہ شریعت کے دائرے میں ہو۔ بعض مرتبہ آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اس معاملے میں شریعت کے حکم پر عمل کروں گا، تو میرے پیسوں میں کمی ہوجائے گی یا نفع میں شاید کمی ہوجائے گی، لیکن یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔

یاد رکھیے! اصل چیز پیسے کی گنتی اور کوانٹیٹی quantity نہیں ہے، بلکہ اصل چیز اس کی کوالٹی quality ہے، درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی میں برکت عطا فرماتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات تھوڑے پیسے میں اللہ تعالیٰ اتنی برکت عطا فرماتے ہیں کہ اس سے بے شمار کام ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات پیسوں کا ڈھیر جمع رہتا ہے مگر سارا کا سارا بیماریوں میں اسپتالوں کے اندر یا عدالتوں کی نذر ہوجاتا ہے، تو بھلا بتلائیے کہ دولت کا وہ ڈھیر جو ڈاکٹروں کے پاس اسپتالوں میں خرچ ہو اور وکلاء کے پاس مقدمات میں خرچ ہو وہ بہتر ہے یا وہ تھوڑا مال جس سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ حلال کمائی میں برکت رکھی ہے۔

حرام میں بے برکتی

حرام مال میں برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرمایا:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ [1]

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سود سے تو مال بڑھتا ہے، لیکن قرآن کہتا ہے بڑھتا نہیں، بلکہ اس کی برکت ختم ہوجاتی ہے اور اس کی راحتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

گنتی کی دنیا

آج دنیا محض گنتی کی بنتی جارہی ہے، گنتی کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری گنتی میں اضافہ ہوگا تو ہمیں فائدہ حاصل ہوگا حقیقت میں گنتی کی بڑھوتری فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچادیتی ہے۔ اس لیے ہم مکمل عزم کریں کہ جو پیسہ آئے گا وہ حلال آئے گا جس کو شریعت نے حلال قرار دیا ہے، اگر وہ کم بھی آئے تو ان شاء اللہ اس میں اللہ تعالیٰ وہ برکت عطا فرمائیں گے جو مال کے ڈھیروں میں نہیں ہوتی، بس ہم اس عزم کے ساتھ تجارت میں لگیں، اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ یہ تجارت عبادت میں تبدیل ہوجائے گی، اور دنیا اور آخرت میں اس کا فائدہ محسوس ہوگا۔

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۷۶)۔

تجارت تربیت کا ذریعہ

اللہ نے تجارت کو ایک ایسا ذریعہ بنایا ہے کہ یہ انسان کی خود تربیت کرتا ہے۔ ویسے دنیا میں بہت سے پیشے ہیں، لیکن تجارت کے اندر اللہ نے بہت عظیم خصوصیات رکھی ہیں، تجارت میں اللہ پر توکل ہوتا ہے، اگر ایک آدمی کسی جگہ پر ملازمت کرتا ہے تو اس کو معلوم ہے کہ مہینے کے ختم پر مجھے اتنی تنخواہ ملنی ہے اور اسے اس کا پکا یقین ہوتا ہے، مگر تاجر جب تجارت کرتا ہے تو اس کو یقین کے ساتھ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا حاصل ہوگا، لہٰذا اس کی ساری تجارت اور سارا کام اللہ کے بھروسے پر مبنی ہے اور یہی توکل علی اللہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے باطن کی عظیم تربیت کرتی ہے۔

میرے بڑے بھائی کا واقعہ

میرے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد ذکی کیفی صاحب جو بڑے شاعر بھی تھے ''کیفیات'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام بھی چھپا ہوا ہے، اگرچہ انہوں نے درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کی تھی، لیکن علماء اور بزرگوں کی صحبت اٹھائی تھی وہ کتابوں کی تجارت کرتے تھے۔ وہ اپنا واقعہ خود سنا رہے تھے کہ ایک دن صبح کو میں اٹھا تو شدید بارش ہو رہی تھی اور سڑکوں پر پانی جمع ہو گیا تھا اور بعض جگہ گھٹنوں تک پانی تھا، تو میرے دل میں خیال آیا کہ آج بارش میں کون مجھ سے کتاب لینے آئے گا، عام طور پر ایسے موقع پر لوگ صرف اپنی ضروریات خریدنے کے لیے نکلتے ہیں، کتاب خریدنے کے لیے کون آئے گا اور وہ بھی دینی

کتابیں، لہٰذا آج میں دکان نہیں کھولوں گا، بند رہنے میں کیا حرج ہے، یہ خیال میرے دل میں آرہا تھا، مگر چونکہ بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے۔ فوراً دل نے جواب دیا کہ گاہک آئے یا نہ آئے یہ تمہارا کام نہیں ہے، بس دکان کھول کر بیٹھ جاؤ، گاہک بھیجنے والا تو کوئی اور ہے وہ اگر چاہے گا تو اس بارش میں بھی گاہک بھیج دے گا، لہٰذا تم اپنا کام کرو اور اللہ اپنا کام کرے گا۔ فرماتے ہیں کہ میں چھتری لے کر پانی سے گزرتا ہوا گیا اور دکان کھول کر بیٹھا اور تلاوت شروع کردی۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ لوگ چھتریاں لگا لگا کر دکان میں کتابیں خریدنے کے لیے آرہے ہیں۔

تجارت کو دوسرے پیشوں پر فوقیت

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ گاہکوں کو بھیجنا درحقیقت اللہ کا کام ہے، ہمیں تجارت کے اندر توکل کا ایک سبق ملتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تجارت کے پیشے کو دوسرے پیشوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے، بس شرط یہ ہے کہ وہ شریعت اور سنت کے مطابق ہو، مگر اس میں منہمک ہوکر انسان اللہ سے غافل نہ ہوجائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
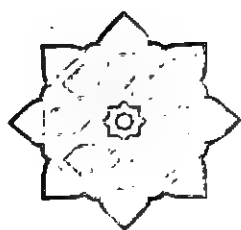
قانون اور معیشت اسلام کی روشنی میں

(خطبات دورۂ ہند ص ۲۸۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قانون اور معیشت اسلام کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا

اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیما (۱)

امنت باللہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالك من الشاھدین والشاکرین، والحمد للہ رب العالمین

تمہید

اس وقت مجھے جس موضوع پر بات کرنے کی دعوت دی گئی ہے اس کا عنوان ہے ''قانون اور معیشت اسلام کی روشنی میں''۔

قانون اور معیشت دونوں الگ الگ مستقل موضوع ہیں، اگر چہ قانون کا تعلق معاشیات سے بھی ہوتا ہے، لیکن دونوں چونکہ الگ الگ مستقل موضوع ہیں، اس لیے ان دونوں کو ایک خطاب میں جمع کرنا مشکل بات ہے، لیکن میں نے قرآنِ کریم کی ایک آیت کریمہ آپ کی خدمت میں تلاوت کی ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں ہماری عظیم رہنمائی کی گئی ہے۔

ایک سوال

اس رہنمائی کا تعلق ایک سوال سے ہے جو لوگوں کے دلوں میں آج کل بکثرت پیدا ہورہا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آج جو ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا اپنا ایک قانونی نظام ہے یا اسلام کا ایک الگ اقتصادی یا معاشی نظام ہے اس سے متعلق اسلام کے مستقل احکام ہیں تو بکثرت یہ بات ہمارے دل میں آتی ہے کہ

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۰۵)۔
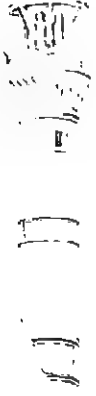
یہ کیسے ممکن ہے کہ چودہ سو سال پہلے جو احکام اور ہدایات ہمیں دی گئی تھیں۔ وہ آج اکیسویں صدی کے حالات پر چسپاں کر دی جائیں۔ زمانہ تغیر پذیر ہے اور حالات بدلتے رہتے ہیں اور انسان کی ضروریات اور حاجتوں میں بھی تغیر آ رہا ہے تو جو اصول چودہ سو سال پہلے بیان کیے گئے وہ اگر آج کی ترقی یافتہ زندگی پر منطبق کیے جائیں تو یہ گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانے کے مترادف ہے، لہٰذا یہ رجعت پسندی اور دقیانوسیت ہوگی۔ یہ سوال ہے جو بکثرت ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور خاص کر ان حضرات کو یہ خیال زیادہ پیدا ہوتا ہے جن کو جدید عصری علوم کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

سوال پیدا ہونے کا سبب

اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ پڑھتے آئے ہیں کہ زندگی ڈائنامک (Dynamic) ہے، وہ ایک جگہ کھڑی ہوئی نہیں ہے اور وہ جامد نہیں ہے۔ زندگی میں ہر آن تغیر آتا رہتا ہے۔ تو اس ذہن سے جب وہ جدید عصری علوم پڑھتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ کسی زمانے میں کوئی نظریہ رائج تھا اور جب دوسرا زمانہ آیا تو اس میں ایک نیا نظریہ آ گیا جس نے پہلے نظریے کو باطل کر دیا۔ ایک زمانے میں ایک طرزِ عمل جاری تھا۔ جب دوسرا زمانہ آیا تو دوسرا طرزِ عمل شروع ہو گیا تو وہ اس بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ چودہ سو سال پہلے جو باتیں کہی گئی تھیں وہ آج کی دنیا پر منطبق کی جائیں تو شاید یہ زیادتی ہوگی۔

آیتِ کریمہ میں اس کا جواب

یہ آیتِ کریمہ جو میں نے تلاوت کی ہے اس میں اس سوال کے جواب کی

طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ آیت ایسی جامع ہے کہ میں کہا کرتا ہوں کہ قانون سے تعلق رکھنے والے، بلکہ تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑی ہدایت ہے۔ قانون سے تعلق رکھنے والے تین ادارے ہیں۔ ایک لیجس لیچر (legislature) ہوتا ہے یعنی قانون ساز ادارہ اور ایک ہوتا ہے قانون کو نافذ کرنے والا ادارہ، جو بنائے گئے قانون کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور تیسرے لائرز (lawyers) ہوتے ہیں جو وکالت کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان تینوں کے لیے اس آیتِ کریمہ میں بڑی جامع ہدایت موجود ہے۔

آیتِ کریمہ کا ترجمہ

اس آیتِ کریمہ کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضورِ نبی کریم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف کتاب اتاری ہے یعنی قرآن تاکہ آپ لوگوں کے درمیان ان احکام کی بنیاد پر فیصلے کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائے ہیں

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا

اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے وکالت کرنے والے نہ بنیں۔

تو یہ جو فرمایا گیا کہ فیصلہ کریں

بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

ان احکام کی بنیاد پر جو اللہ نے آپ کو دکھائے ہیں اس میں ہدایت ہے لجس لیچر کو کہ انہی احکام کے مطابق لجس لیچر کرنا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول نے بیان فرمائے ہیں اور ججوں کے لیے حکم یہ ہے کہ آپ فیصلہ کریں ان احکام کی

بنیاد پر اور وکلاء کے لیے یہ ہدایت ہے کہ ''وَلَا تَكُنْ لِّلْخَائِنِيْنَ خَصِيْمًا'' کہ آپ مجرموں کے طرف دار بن کر ان کی طرف سے وکالت نہ کیجیے، اس لیے اس آیت میں تینوں کے لیے مختصر طور پر ہدایت موجود ہے۔

حصول علم کے ذرائع

اب جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس لیچر کے لیے جو ہدایت بیان فرمائی گئی بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ یعنی اللہ نے آپ کو جو چیز دکھائی ہے اس کی بنیاد پر فیصلے کریں۔ اس کو سمجھنے کے لیے انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں خود سے نہیں آگیا، بلکہ ایک پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اگر کسی شخص کا خدا پر بھروسہ واعتقاد ہی نہیں ہے تو ہمیں اس سے بحث ہی نہیں، لیکن جس آدمی کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے اور وہی اس کا خالق ومالک ہے، اسی نے اس کو اس دنیا میں بھیجا تو نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جب اس نے بھیجا ہے تو ضرور کوئی ہدایات دے کر بھیجا ہوگا اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آنے کے بعد ہر قدم پر علم کی ضرورت ہے، علم اور معلومات کی بنیاد پر ہی وہ اس دنیا میں صحیح زندگی گزار سکتا ہے، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو علم حاصل کرنے کے لیے کچھ وسائل اور ذرائع عطا فرمائے ہیں جس کے ذریعے وہ علم حاصل کرتا ہے اور ان ذرائع کا حال یہ ہے کہ ان میں ہر ایک ذریعہ کا ایک مخصوص دائرہ ہے۔ ایک ذریعہ سے انسان ایک حد تک علم حاصل کرتا ہے اور پھر وہ ذریعہ ختم ہوجاتا ہے اور حصول علم کا دوسرا ذریعہ شروع ہوجاتا ہے۔

پہلا ذریعہ "حواس"

مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس عطا فرمائے ہیں۔ آنکھ ہے جس سے آدمی دیکھتا ہے، کان ہے جس سے آدمی سنتا ہے، ہاتھ ہے جس سے آدمی چھوتا ہے، ناک ہے، جس سے آدمی سونگھتا ہے اور زبان ہے جس سے آدمی چکھتا ہے۔ ان حواس کے ذریعے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو آنکھ سے دیکھ کر معلوم ہوتی ہیں، بہت سی چیزیں کان سے سن کر، بہت سی چیزیں ناک سے سونگھ کر اور بہت سی چیزیں زبان سے چکھ کر معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کا ایک دائرہ رکھا ہے کہ جو چیز آنکھ سے دیکھ کر معلوم کی جاتی ہے اس کا علم آنکھ ہی دے گی، کوئی شخص کان سے آنکھ کا کام لینا چاہے اور کان سے دیکھنا چاہے تو یہ ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کان بے کار چیز ہے، بلکہ کان بہت کارآمد ہے بشرطیکہ اسے اسی مقصد میں استعمال کیا جائے جس مقصد کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے تو کان سے ہم سن سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے، آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں سن نہیں سکتے، لہٰذا ہر ایک کا ایک دائرہ ہے جس میں وہ کام کر رہے ہیں اور جہاں یہ پانچ حواس کام نہ کریں تو اللہ نے ایک اور ذریعہ حصولِ علم کا پیدا فرمایا وہ ہے عقل۔ تو جو چیزیں ان پانچ حواس سے معلوم نہیں ہوسکتیں وہ عقل کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں۔

اس کی ایک مثال میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ میرے ہاتھ میں ایک پستول ہے تو میں نے آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کیا کہ یہ ایک آلہ ہے، میں نے ہاتھ سے چھوکر یہ معلوم کیا کہ یہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ میں نے اس کی نالی کو سونگھا تو معلوم ہوا کہ اس میں بارود استعمال ہوتا ہے، میں نے

اس کو دبا کر کسی پر گولی چلائی تو مجھے آواز سے یعنی کان سے سن کر پتہ چلا کہ یہ کوئی دھماکہ کرنے والی چیز ہے، لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ یہ ہتھیار ریوالور کس نے بنایا ہے؟ تو چونکہ میری آنکھ اس کو نہیں دیکھ رہی، میرے کان اس کی آواز کو نہیں سن رہے، میں چکھ کر بھی اس کا پتہ نہیں لگا سکتا غرض یہ کہ یہ پانچوں حواس مجھے یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ کس نے بنایا ہے؟ اس کے بعد میں نے عقل سے سوچا تو پتہ چلا کہ یہ ایک ایسا sophisticated قسم کا ہتھیار ہے یہ یقیناً خود بخود وجود میں نہیں آسکتا کسی ماہر انسان نے اس کو بنایا ہے۔ تو یہ علم مجھے پانچ حواس سے نہیں، بلکہ عقل سے حاصل ہوا۔

دوسرا ذریعہ ''عقل''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتدائی طور پر پانچ حواس عطا فرمائے۔ جہاں یہ حواس کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو پھر عقل کا ذریعہ عطا فرمایا، لیکن جس طرح پانچ حواس کا دائرہ کار محدود ہے۔ اسی طرح عقل کا دائرۂ کار بھی محدود ہے۔ یہ ہر چیز کا علم ہمیں عطا نہیں کر سکتی، اس کا بھی ایک دائرہ کار ہے اس کے بعد وہ کام کرنا چھوڑ دیتی ہے یا انسان کو غلط علم عطا کرتی ہے۔ جیسے میں نے آپ کو پستول کی مثال دی کہ ظاہری حواس سے اس کے بارے میں پتہ چل گیا اور عقل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی ماہر کاریگر نے اس کو بنایا ہے۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کون سا استعمال صحیح ہے اور کون سا استعمال غلط ہے؟ اس کے جواب میں بھی عقل تھوڑی بہت رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً عقل یہ کہتی ہے، اس سے کسی کو بلاوجہ قتل کرنا بری بات ہے، لیکن ایک بات اور ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کو بلاوجہ قتل کر دیا، تو اس قاتل کے ساتھ کیا سلوک

کرنا چاہیے؟ یہاں جب میں اپنی عقل کو کام میں لاتا ہوں تو عقل مجھے دو متضاد جواب دیتی ہے۔ ایک یہ کہ ایک آدمی کا قتل ہوگیا، اس کی جان چلی گئی، اس کی بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہوگئے، تو ایک گھر تباہ ہوا ہے اب اگر اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کرو گے تو دوسرا گھر تباہ ہوجائے گا، اس کی بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہوں گے اور بیوہ اور یتیم ہونے کی جو مصیبت ہے وہ ان بے گناہوں کو اٹھانی پڑے گی، اس لیے کہ انہوں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ لہٰذا قاتل کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے اس کو اور کوئی سزا دے دی جائے یا اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔

عقل کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس شخص نے دوسرے کی بلاوجہ جان لی ہے اگر آپ اس کو قتل نہیں کریں گے تو قاتلوں کی ہمت افزائی ہوگی اور وہ نہ جانے اور کتنے خاندان اجاڑتے پھریں گے تو عقل کنفیوژ confuse ہوجاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان بھٹک جاتا ہے تو یہاں ہماری عقل پوری طرح سے رہنمائی نہیں کررہی ہے۔

تیسرا ذریعہ "وحی الٰہی"

اس موقع پر اللہ نے ہمیں تیسرا ذریعۂ علم عطا فرمایا اور وہ ہے وحی الٰہی جو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انبیاءِ کرام علیہم السلام پر نازل ہوئی ہے اور یہ وحی ایسی جگہوں میں آتی ہے جہاں انسان کی عقل یا تو کوئی جواب نہیں دے سکتی یا لغزش کھا سکتی ہے۔ وہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے ذریعے وحی الٰہی کا ایک سلسلہ جاری فرمایا ہے جو علم کا تیسرا ذریعہ ہے جس طرح حواس خمسہ اور عقل صرف ایک حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے

تمام مسائل کا علم عقل کی بنیاد پر ڈھونڈنا چاہا ان کی تاریخ آپ پڑھ کر دیکھیے کہ وہ عقل جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد تھی اس نے ان کو کہاں تک پہنچادیا۔ ہر فلسفی کا نظریہ عقل پر مبنی ہوتا ہے، چاہے وہ ارسطو ہو یا افلاطون یا برٹرینڈرسل۔ ہر ایک کا نظریہ کسی نہ کسی عقلی دلیل پر مبنی ہے اور ہر ایک کی رائے الگ الگ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں شوشلزم کا ڈنکا بجا ہوا تھا اور ہر شخص شوشلزم اور کمیونزم کے پیچھے چل رہا تھا، مگر ایک وقت آیا کہ وہ سیاسی شکست کھا گیا تو اب سرمایہ دارانہ نظام نے بغلیں بجائیں اور کہا کہ اب ہمارا نظام ہی ترقی کرے گا اور یہی قابلِ تقلید ہے اور دونوں کی بنیاد عقل پر تھی۔ لہٰذا عقل جب وحیِ الٰہی سے آزاد ہوکر کام کرتی ہے تو اس وقت ایسے ایسے مضحکہ خیز نظریات سامنے آتے ہیں کہ ان پر حیرت ہوتی ہے کہ آدمی وہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔

مضحکہ خیز نظریات

نظریات کی تاریخ میں ایک فرقہ گزرا ہے جسے باطنی فرقہ کہا جاتا ہے، اس کا ایک لیڈر ہے، جس کا نام عبید اللہ حسن قیروانی ہے۔ اس نے اپنے متبعین کے نام ایک خط لکھا ہے، علامہ بغدادی نے اپنی کتاب ''اَلْفَرق بین الفِرَق'' میں وہ خط نقل کیا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ یہ بڑی ہی بے عقلی کی بات ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں اس کی اپنی بہن موجود ہے، وہ بہن بہت خوبصورت، سلیقہ شعار اور بھائی کی مزاج شناس بھی ہے۔ اس بہن کا تو وہ ہاتھ پکڑ کر کسی تیسرے کے حوالے کردیتا ہے اور خود اپنے گھر ایسی بیوی لے کر آتا ہے جو نہ اس طرح کی سلیقہ شعار اور خوبصورت ہوتی ہے اور نہ اس کا مزاج اس

طرح پہچانتی ہے، جیسے اس کی بہن پہچانتی تھی۔ اگر اس کو ذرا بھی عقل ہوتی تو اپنی گھر کی دولت کو اس طرح باہر نہ کرتا اور باہر والی کسی اور کو اپنے پاس نہ لاتا، لہٰذا عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک بہن اگر اپنے بھائی کے لیے کھانا تیار کرسکتی ہے، اس کے لیے بستر بچھا سکتی ہے تو وہ اگر اس کی جنسی خواہش بھی پوری کردے تو اس میں کیا برائی ہے؟ آپ اس نظریہ پر جتنی چاہے لعنت بھیجیے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خالص عقل کی بنیاد پر اس کو تولا جائے تو اس دلیل کا توڑ آسان نہیں۔

مغربی دنیا کی گمراہی

اسی وجہ سے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا میں یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ بہنوں سے بھی نکاح ہونا چاہیے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم جنس پرستی کی وباء بھی پھیل رہی ہے کہ دو مردوں کے درمیان نکاح اور تعلق کا بل پاس ہورہا ہے، یہ سب اس لیے ہورہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اسی میں ہمیں لذت ملتی ہے اور اسی میں دلوں کو تسکین حاصل ہوتی ہے تو درمیان میں رکاوٹ ڈالنے والا کون ہے؟ چنانچہ آپ دیکھیے کہ پوری مغربی دنیا میں شور مچا ہوا ہے اور اگر کوئی شخص یہ بات اٹھائے کہ Homosexuality برائی ہے تو وہ ان کی نظر میں پرلے درجے کا دقیانوسی اور رجعت پسند ہے، حتیٰ کہ وہ لوگ اس کے لیے مرنے مارنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔

اہلِ مغرب کی بے بسی

جس وقت سب سے پہلے برطانیہ میں ہم جنس پرستی کا بل پاس ہورہا تھا تو

اس وقت اس بل کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، جو Wolfenden Committee کے نام سے مشہور تھی۔ تو اس کمیٹی کی رپورٹ کا میں نے مطالعہ کیا، اس میں ان لوگوں نے ایسی بے چارگی اور بے بسی کا اظہار کیا ہے کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے، بلکہ ایک برائی ہے، لیکن اس معاشرے میں جہاں ہر فردِ بشر کو آزادی دینے کا اقرار کیا گیا ہے ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اس کی مخالفت کریں۔ ہمارے چارٹر charter میں یہ بات داخل ہے کہ ہم ہر انسان کو اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی اجازت دیں۔ لہٰذا اس وجہ سے ہم اس کی تائید کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ

> Unless the crime is equitted with a sin, there is no room for baring this legislation

> یعنی جب جرم کو گناہ کے برابر قرار نہ دیا جائے، اس وقت تک اس کو روکنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔

اس کے بعد اسی کمیٹی کی رپورٹ کا اقتباس نقل کرتے ہوئے اس jurisprudence کے ماہر Dr.Friedman نے لکھا ہے کہ درحقیقت یہ ایک نظریہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ عقل بھی کوئی چیز نہیں، اصل چیز خواہشات ہیں اور اس پر کوئی روک نہیں لگائی جاسکتی اور اس دنیا میں اچھی اور بری چیزوں کا کوئی تصور نہیں۔ بس اچھی چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش تسلیم کرے اور بری چیز وہ ہے جسے انسان کی خواہش برا سمجھے اور باقاعدہ یہ نظریہ ہے کہ کسی بھی چیز کو خیر مطلق یا شر مطلق قرار نہیں دیا جاسکتا۔ درحقیقت قرآنِ کریم کی آیت اس وقت یاد آتی ہے۔

وَلَوِاتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ [1]

اگر حق خواہشات کے پیچھے چلنے لگے تو پھر زمین وآسمان کا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔

اس لیے ہم وحی کے ذریعے ہدایات بھیجتے ہیں، اگر یہ ہدایات نہ ہوں تو تمہاری عقل ایک مرحلہ پر جا کر ایسے بھٹکے گی کہ تمہیں گمراہی کے بدترین گڑھے میں لے جا کر پھینک دے گی اس لیے ہم کہتے ہیں:

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

کہ اللہ کی بتائی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو۔

عقل ایک موم ہے

عقل ایک موم ہے کہ اس کو جس طرح چاہو موڑ لو، لہٰذا عقل کو اگر شریعت کی حدود سے ہٹ کر استعمال کیا جائے تو وہ ایک موم ہے۔ ہر شخص اپنی خواہشات کے مطابق اس کو موڑ سکتا ہے۔ دیکھیے! آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ساری دنیا ایٹم بم کی ہولناکیوں کو جانتی ہے اور میں اپنی آنکھوں سے ہیروشیما کے اندر اس کی تباہ کاریاں دیکھ کر آیا ہوں، واقعی وہ ایک ہلاکت خیز ہتھیار ہے، لیکن آج سے پانچ سال پہلے کا ''انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا'' (Encyclopedia Britannica) نکالیے اور ایٹم بم کا مقالہ پڑھیے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایٹم بم وہ ہتھیار ہے جس کے بارے میں Churchill نے یہ کہا تھا کہ اس ہتھیار کے ذریعے دس لاکھ امریکیوں کی جان بچائی گئی ہے، لیکن اس کا تذکرہ

[1] سورۃ المومنون آیت (۷۱)۔

نہیں کہ اس سے ہیروشیما اور ناگاساکی میں کتنی تباہ کاری مچائی گئی، بلکہ تذکرہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے دس لاکھ امریکیوں کی جان بچائی گئی ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر ایٹم بم نہ پھینکا جاتا تو جنگ جاری رہتی اور اس کے نتیجے میں دس لاکھ امریکی مارے جاتے۔ تو میں نے کہا کہ عقل ایک موم ہے اس کو جس طرح چاہو موڑلو۔ قرآنِ کریم نے عقل کو اس کی حد پر رکھا ہے جہاں تک عقل کام دیتی ہے وہاں تک بے شک وہ بہت مفید چیز ہے، لیکن حد سے آگے بڑھ کر اس سے کام لیں گے تو وہ انسان کو گمراہیوں میں پھینک دے گی۔

عقل ترازو کی طرح ہے

علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ مقدمے کے اندر فرماتے ہیں کہ عقل کی مثال ایک ترازو کی سی ہے۔ ایک ترازو وہ ہوتی ہے جس سے سونا اور چاندی تولا جاتا ہے اور وہ سونا چاندی کے تولنے کی حد تک بہت اچھی اور بہت مفید چیز ہے، لیکن اگر اس میں پہاڑ تولنے لگیں تو وہ ترازو ٹوٹ جائے گی اور کام نہیں دے گی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترازو خراب ہے، بلکہ بہت مفید اور اچھی چیز ہے، بشرطیکہ اس سے اس کی حدود میں کام لیا جائے۔ اگر اس سے بہت زیادہ کام لیں گے تو وہ ہلاکت کے گڑھے میں پہنچادے گی۔

آج کی معیشت کو دیکھیے کہ جب ہم کہتے تھے کہ سود حرام ہے تو کہنے والے یہ کہتے تھے کہ چودہ سو سال والی پرانی بات ہے اور یہ بھی کہتے تھے کہ سود تو وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں غریبوں کو قرضہ دیا جاتا تھا اور اس سے سود حاصل کیا جاتا تھا۔ لہٰذا اس کی وجہ سے اس کو حرام قرار دیا گیا تھا، لیکن آج کا جو بینکنگ سسٹم ہے اس میں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ بینک سے

جو لوگ قرضہ لیتے ہیں وہ کاروبار میں لگاتے ہیں اور اس سے نفع کماتے ہیں اگر اس میں سے تھوڑا سا نفع انٹرسٹ interest کے طور پر وصول کرلیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا سسٹم اور تھا اور ہمارے زمانے کا اور ہے۔

ایک لطیفہ

میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ انڈیا کا ایک گویا (singer) تھا۔ وہ حج کرنے کے لیے گیا۔ حج کے بعد اس نے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ راستہ میں ایک منزل پر ٹھہرا تو دیکھا کہ وہاں ایک عرب گویّے نے گانا شروع کردیا اور اپنی music بھی بجانی شروع کردی۔ اس انڈین سنگر کو اس کی آواز بہت بھدّی معلوم ہوئی، تو اس کو دیکھ کر کہنے لگا کہ میں قربان جاؤں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے ان عرب بدوؤں کی موسیقی سنی، اس واسطے اس کو ناجائز قرار دے دیا۔ اگر میری موسیقی سن لیتے تو کبھی ناجائز نہ کہتے۔ تو آج کل اسی قسم کا استدلال سود کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے، لیکن اب 2008 میں فائنانشیل کرائسز financial crisis میں جو پوری دنیا مبتلا ہوئی اس نے دنیا کو دکھا دیا کہ سود کی تباہ کاریاں کیا ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کو برحق قرار دینے اور اس پر بغلیں بجانے والے آج اس فائنانشیل کرائسز کے گڑھے میں اس طرح گرے کہ بلبلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنے نظام کو ایسی بنیادوں پر استوار کیا جس کے نتیجے میں ہم آج اس بحران کا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر اقبال نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اللہ تعالیٰ نے آج وہ دن دکھادیا۔

فائنانشل کرائسز کا سبب

اگر اس فائنانشل کرائسز کا جائزہ لیا جائے اور میں نے اپنے آرٹیکل میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ اس فائنانشل کرائسز کے بنیادی اسباب کیا ہیں۔ ان تمام اسباب کا خلاصہ نکالا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر

بِمَا اَرٰىكَ اللّٰہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اصولوں پر عمل کیا جاتا تو کبھی اس طرح نہ ہوتا۔ اس کی بنیاد سود پر ہے۔ کرائسز کا سب سے بڑا سبب سود ہے۔ اسی کا ایک حصہ قرضوں کی خرید وفروخت اور اسٹاک ہیں۔ اسی کا ایک حصہ speculative transcations ہیں اور اس کا سب سے بڑا حصہ derivatives, futures, options اور swapes ہیں۔ اِن کی مارکیٹ ہے جس نے پوری دنیا کی معیشت کو ایک غبارے میں تبدیل کردیا۔ جن کے پیچھے کوئی real economy اور real asset نہیں ہوتی۔ وہ تمام تر ایک غبارہ ہے جس میں سوائے تصورات کے کوئی اور چیز موجود نہیں۔ آج اگر money supply کو دیکھیں تو اس کا صرف 3% کرنسی real notes کی شکل میں ہیں۔ باقی سارا کا سارا مصنوعی زر یعنی artificial money ہیں جو بینکوں کے ذریعے، ربو اور سود کے ذریعے اور derivatives کے ذریعے پیدا کی گئی ہیں اور derivatives کی

مجموعی worth کو آپ دیکھیں تو وہ ساری دنیا کی مجموعی یعنی aggregate GDP (Gross Domestic Product) اس سے آٹھ گنا زیادہ derivatives ہیں۔ ان کے پیچھے real asset موجود نہیں۔ یہ سارا کا سارا نظام عقل کی بنیاد پر چلا تھا۔

ایڈم اسمتھ (Adam Smith) نے کہا تھا کہ ہم مارکیٹ سسٹم پر معیشت کو آباد کریں گے، جس میں profit motive بنیادی اہمیت ادا کرے گا۔ وہ مارکیٹ سورسز بھی خود determine کرے گی کہ profit کس طرح حاصل کیا جائے۔ اس پر کوئی خدائی پابندی نہیں۔ لہٰذا profit motive نے انسان کو یہاں تک پہنچا دیا۔

قرآن اور اسلام میں کچھ پابندیاں ہیں

قرآن اور اسلام یہ کہتا ہے کہ بے شک مارکیٹ سورسز برحق ہیں اور بے شک profit motive بھی درست ہے، لیکن profit motive پر کچھ پابندیاں ہیں۔ وہ اللہ کی لگائی ہوئی پابندیاں ہیں، وہ بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ کی بنیاد پر پابندیاں لگائی گئی ہیں کہ تم بے شک نفع کمانے کے لیے آزاد ہو، لیکن نفع اگر سود کے ذریعے کماؤ گے تو ناجائز، قمار کے ذریعے کماؤ گے تو ناجائز۔ سٹہ کے ذریعے کماؤ گے تو ناجائز اور کسی کو دھوکہ دے کے کماؤ گے تو ناجائز۔ اگر ان پابندیوں کے ساتھ معیشت کا پہیہ چلے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ ایسا بحران یقیناً کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

اللہ کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی

جو بات میں کہنا چاہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ درحقیقت اس دنیا میں قانونی کتابوں کے اندر بے شک تغیر آتا رہتا ہے اور اس تغیر کے تحت قوانین بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلنے بھی چاہئیں، لیکن اس تبدیلی کو لامحدود نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی نہ کوئی ایسی حد ہوگی جہاں پر تبدیلی ممکن نہ ہو اور یہ بات سارے قانون دان اور لجس لیچر کے مصنفین نے تسلیم کی ہے کہ کچھ قوانین ایسے رہنے چاہئیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے چند پابندیاں عائد کی ہیں، وہ ایسی ہیں کہ ان کو کسی زمانے میں بدلا نہیں جاسکتا، ان پابندیوں کے سوا باقی چیزوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے یعنی باقی ساری فضا کھلی چھوڑ دی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مباحات کا دائرہ اتنا وسیع کیا ہے کہ اس میں قانون سازی اور حکمتوں اور مصلحتوں کی گنجائش ہے اور اس میں لوگوں کے باہمی آراء ومشوروں کی بھی گنجائش ہے، لیکن ان اصولوں کو ہمیشہ برقرار رکھنا ہوگا جن کا اس آیت کریمہ میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ

کہ اس نے تمہیں وحی کے ذریعے حق دکھا دیا ہے اب تمہیں عقل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔

ایک اور شبہ اور اس کا جواب

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی ملتا ہے وہ یہ کہ بعض حضرات کے دل

میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے تو اسلام نے ہمیں سارے احکام دئے ہیں مگر سائنس اور ٹیکنالوجی کا فارمولا نہیں دیا۔ واقعات بتائے ہیں، جنت جہنم کا تذکرہ کیا ہے، لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کا کوئی فارمولا نہیں دیا جس کو قرآن سے اخذ کر کے ہم دنیا پر اپنی فوقیت جتا سکتے کہ دیکھو ہمارے قرآن نے کتنا بڑا فارمولا دیا ہے اس کے نتیجے میں یہ ٹیکنالوجی وجود میں آئی ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فارمولے عقل اور تجربے کے دائرے میں آتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالعمل بنایا ہے اللہ نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا کہ تم اپنی عقل، تجربہ اور مشاہدہ سے جتنا کام لوگے، جتنی محنت کروگے اتنا ہی ٹیکنالوجی میں آگے بڑھتے چلے جاؤ گے، لیکن قرآن اس جگہ آتا ہے جہاں عقل کی رہنمائی محدود ہوجاتی ہے اس لیے وہ قرآن کا موضوع ہی نہیں وہ انسان کی عقل اور تجربے کا موضوع ہے، اگر ہم مسلمان اس میں پیچھے رہ گئے ہیں تو وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے ہے، اگر ہم اپنے تجربات اور مشاہدوں کو جاری رکھتے تو پیچھے نہ رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالعمل بنایا ہے کہ جو اپنے علم اور تجربہ سے فائدہ اٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں کامیاب فرمائیں گے چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے، میں آج صبح ہی یہ کہہ رہا تھا کہ کوئی بھی قوم جس کو ہم باطل پر سمجھتے ہوں وہ اپنے باطل کی وجہ سے ترقی نہیں کرسکتی وہ کسی حق صفت کی وجہ سے ترقی کرتی ہے۔ اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

مطلب یہ ہے کہ مغرب کی قوت موسیقی کی محفلوں کی وجہ سے نہیں ہے، نہ اس وجہ سے کہ اس کی عورتیں ننگی ناچ رہی ہیں، نہ اس وجہ سے کہ انہوں نے خوبصورت عورتوں کو بازاروں کا سرمایہ بنادیا، نہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی پنڈلیاں ننگی کرلی ہیں اور بال تراش لیے ہیں۔ اس کی قوت تو اپنے علم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ حکمت اور علم کپڑے بدلنے سے حاصل نہیں ہوتا کہ آپ کوٹ پتلون پہن لیں تو حکمت آگئی۔ عمامہ پہن لیں تو حکمت غائب ہوگئی ایسے نہیں، بلکہ حکمت علم اور ہنر تو عمل، محنت اور جد وجہد چاہتا ہے تو درحقیقت یہ دائرہ چونکہ عقل اور تجربہ کا تھا اس لیے قرآن نے اس کو ٹچ touch نہیں کیا۔ اس کو ہمارے جہد وعمل پر چھوڑ دیا جتنی ہم جد وجہد کریں گے اتنا آگے بڑھیں گے جو چیز عقل کے ذریعے تنہا معلوم نہیں ہوسکتی تھی وہ اللہ نے قرآن کے ذریعے ہمیں بتادی کہ توحید کیا ہے؟ آخرت کیا ہے؟ جنت جہنم کیا ہے؟ اور کون سے احکام واجب التعمیل ہیں؟ کس کے ذریعے انسانیت فلاح پاسکتی ہے؟ کس کے ذریعے انسانیت گمراہ ہوسکتی ہے؟

یہ تھا اصل موضوع قرآنِ کریم کا جو اس نے اختیار کیا ہے۔ باقی چیزوں میں قرآن نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا کہ جتنی چاہو تم ترقی کرتے جاؤ اور ان اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے جو جہد وعمل کروگے دنیا کے اندر اس کا پھل پاؤ گے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ

تم شوق سے کالج میں پڑھو باغ میں پھولو
جائز ہے غباروں پہ اڑو چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اللہ تعالیٰ اس پیغام پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری فکر اور سمجھ میں سلامتی عطا فرمائے اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
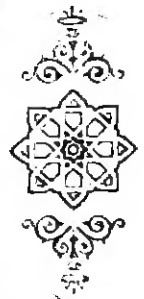
مواعظِ عثمانی

اصلاحی تقاریر ومضامین کا موضوع وار مجموعہ
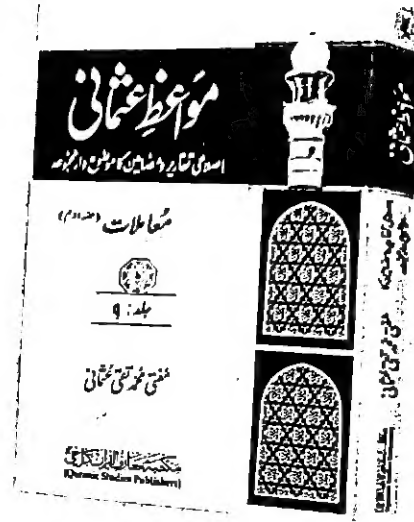
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکروفکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریرِ ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شامل شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)